TEXT LIGHT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188349
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩٢٨ / ح ي

Accession No. ٥٢٩٤٥

Author حالي، الطاف حسين

Title يادگار حالي

G. 2975

This book should be returned on or before the date last marked below

یادگار غالب

مؤلفہ

شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

پبلشر

رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا الہ آباد

۱۹۳۱ء

شانتی پریس الہ آباد

Rs. 2/8.

باھتمام کے۔بی۔اگروالا
شانتی پریس الہ آباد

فہرستِ مضامین یادگار غالب

مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱ تا ۸
آغاز کتاب	
تاریخ ولادت	۹
خاندان	″
تاہل	۱۵
سفر کلکتہ	۱۷
مجادلہ اہل کلکتہ	۲۰
قیام لکھنؤ	۲۴
ملازمت سرکاری سے انکار ..	۲۶
فید ہونے کا واقعہ	۲۷
قلعہ کا تعلق	۳۱
مہر نیمروز ماہ نیم ماہ	″
خدمت اصلاح اشعار بادشاہ	۳۲
بدیہہ گوئی	۳۳
اولاد کا مرثیہ	۳۴
حالات غدر	۳۵

مضمون	صفحہ
وظیفہ رامپور	۳۸
قاطع برہان	۳۹
قاطع برہان کی مخالفت اور اُس کی وجہ	۴۱
قاطع برہان کی تائید	۴۲
گمنام خطوں میں گالیاں ..	۴۸
راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ	۴۹
استعداد عربی	۵۵
فارسی دانی	″
عروض	″
نجوم	″
تصوف	″
تاریخ	۵۶
خط	″
شعر خوانی	″

مضمون	صفحہ
مرزا کے اخلاق وعادات وخیالات	
وسعت اخلاق	۵۷
مروت	۵۸
فراخ حوصلگی	۵۹
شعر فہمی	۶۱
کتاب فہمی	۶۲
حسن بیان اور ظرافت	۶۳
خودداری	۶۴
خوراک	۶۵
آموں کی رغبت	۶۶
حسن طلب	〃
ناؤ ونوش	۶۷
اسلام کا یقین	۷۰
شوخی بیان	۷۲
بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا	۷۳
سلامتی طبع	۷۴
مسئلہ امتناع النظیر	
خاتم النبیین	۷۵
داد سخن	۷۸

مضمون	صفحہ
تقریظ لکھنے کا ڈھنگ	۸۰
تقریظ دیوان تفتہ	〃
تقریظ تصحیح آئین اکبری	۸۱
محققانہ نظر	۸۳
حق پسندی	۸۴
راست گفتاری	۸۵
ناقدردانی کی شکایت ..	۸۶
سخن فہموں کی قدر اور	
منشی حقیر کی تعریف	۸۷
اپنے عجز کا اقرار	۸۸
ہجو نہ لکھنا	۸۹
خانگی تعلقات	۹۲
موت کی آرزو	۹۵
اخیر عمر کی حالت	۹۶
مرض الموت کی حالت	〃
تاریخ وفات	۹۷
جنازے کی نماز	〃
شاگردوں کی کثرت	۹۸
نواب ضیاء الدین احمد خاں ..	۱۰۰
نواب محمد مصطفیٰ خاں	۱۰۱

مضمون	صفحہ
دوسرا حصہ	
مرزا کے کلام پر ریویو اور اسکا انتخاب	
استعداد سبق	۱۰۳
دیوان ریختہ	۱۰۵
فطرت انسانی	۱۱۷
فضیلت انواع انسانی	۱۱۸
شکایت اہل وطن	۱۱۹
حسن بیان کی تعریف	۱۲۱
دوسری خصوصیت	۱۲۴
تیسری خصوصیت	۱۲۵
چوتھی خصوصیت	۱۲۶
شکوہ اہل وطن	۱۳۹
انسان کی مجبوری	۱۴۳
نتیجہ بے اعتدالی	۱۵۱
غزل بہاریہ و شکر صحت بادشاہ	۱۵۳
قطعات	۱۵۹
رباعیات	۱۶۳
نثر اردو	۱۶۵
شوخی	۱۷۱

مضمون	صفحہ
نظم و نثر فارسی	۱۸۷
انتخاب غزلیات فارسی	۱۹۶
رباعیات فارسی	۲۶۸
قصائد	۲۷۸
توحید	۲۷۹
مرثیہ و نوحہ	۲۸۱
ستایش روزگار	۲۸۵
صفت سالکان طریقت	۲۸۶
صفت موسم بہار	۲۸۸
کیفیت آغاز موسم سرما	۲۹۳
صفت موسم بہار	۲۹۴
کیفیت صبح	۲۹۵
بند اول	۲۹۶
قطعات فارسی	۳۰۱
بند دوم	۳۰۵
بند سوم	۳۰۶
بند چہارم	۳۰۸
بند پنجم	۳۰۹
بند ششم	۳۱۰
بند ہفتم	۳۱۱

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
نثر فارسی	۳۲۱	از تقریظات و دیباچہ ہائے ..	۳۴۵
نثر فارسی کے نمونے	۳۲۴	از دیباچہ دیوان فارسی	۳۴۷
فخریہ فقرے	۳۲۸	از خاتمہ دیوان فارسی	۳۴۹
طرز واقعہ نگاری	۳۳۰	از دیباچہ دیوان تفتہ	۳۵۰
پارۂ از احوال تیمور	۳۳۳	**انتخاب از مکاتبات**	۳۵۲
پارۂ از احوال ہمایوں و شیر شاہ ..	۳۳۷	شیخ علی حزیں اور مرزا کے	
پارۂ از دستنبوہ	۳۳۸	طرز بیان کا مقابلہ	۳۸۶
غدر کے اسباب	"	مرزا اور ابو الفضل کی	
کیفیت شورش باغیان در دہلی	۳۴۰	طرز بیان کا مقابلہ	۳۸۹
پارۂ از دیباچہ ثانی درفش کاویانی ..	۳۴۲	**خاتمہ**	۳۹۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور انکی دولت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں، اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں:-

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود　　یاد در خلوت شاں مشک فشاں زدم شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاہ　　حسرتی اشرف و آزردہ بو د اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا، اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگر گو نہ آئیں نہاد　　شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں **غالب** جن کی عظمت وشان اس سے بالاتر تھی کہ انکو بارہویں یا تیرہویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشاپردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب "مہر نیمروز" میں مرقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ "شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا؛ مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے ساتھ تول لیا جائے" اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف نہیں شاید خودستائی اور تعلّی پر محمول کریں گے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا؛ بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو اُنکے زمانے کے اہل نظر اور اہل تمیز اُن کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ قدر نہیں کی، انکا تمام کلام؛ اُردو، فارسی، نظم، اور نثر انکے جیتے ہی جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا تھا؛ اُن کے مانگنے والے اور مداح وثنا خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں؛ مدحیہ قصائد پر انکو کم وبیش صلے اور خلعت والنعام بھی ملتے رہے، مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق انکی خاصی قدر کی، ریاست رامپور سے انکے لئے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا؛ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبہ کا جو شاعری وانشاپردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے

بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا، یا جہانگیر و شاہجہاں، مگر جس قدر اس اخیر دور میں انکو مانا گیا اسکو بھی نہایت معتنم سمجھنا چاہیے۔

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام انکی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے انکی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہوگیا، اور اُردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے، اسلیے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوسکیں اور انکی شاعری و انشاپردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زمان کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، انکو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔

پچھلے برسوں میں جبکہ میں دلی میں مقیم تھا بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جسقدر اس میں ان کے حالات و اخلاق و عادات کا سراغ ملا انکو قلمبند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں انکو بھی ضبط تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہوگیا، اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ دوستوں

کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا، اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہوسکتی ہیں انکو اب زیادہ حالتِ منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں۔

میں نے اُن مٹھوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا مگر انکے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی، اور اسکے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہونگی، میں نے دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور اُنھوں نے مہربانی فرماکر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جسقدر مرزا کے حالات انکو معلوم ہوسکے لکھکر میرے پاس بھیجدیے، اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اسکی تکمیل ہوسکتی تھی مکمل کی گئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی منوّہ بالشان واقعہ انکی شاعری انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات انکی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں انکو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرایے میں ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں کبھی عشقبازی اور رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حُبّ البیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

---

* یعنی نواب سعیدالدین احمد خاں خلف الصدق نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا برادر نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گزرے ہیں جنکے زمانے میں اُنکی قدر و منزلت کا پورا پورا اندازہ نہیں کیا گیا، مگر آخر کار انکا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اسکے اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اس پر ترجیح دیتے تھے مگر کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ سعدی کا نام اور اسکا کلام اطراف عالم میں منتشر ہوگیا، اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا شکسپیر کے عہد میں اُسکو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں۔

تا زدیوانم کہ مرست سخن خواہد شدن ۔۔۔ ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است ۔۔۔ شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی یہ اُمید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبول خاص و عام ہوگی، لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر انکی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے، کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ انکے اصناف کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا، ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں از اکتیں

اور باریکیاں ظاہر کیجاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اس طبقے کے شاعروں کے کام کا موازنہ کیا جاتا، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے قصیدے کو، اور اسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اس طرح مرزا کے پایۂ شاعری اور انکے کلام کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اُسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا، اگر ہم اس دشوار گزار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانیوالوں کو مزا نہ آیا"۔

ناچار ہم نے بجائے طریقۂ مذکور کے جو حالتِ موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لئے سہل تر اور پبلک کے لئے مفید تر معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے، نظم اُردو، نثر اُردو، نظم فارسی اور نثر فارسی، اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے ہر قسم پر اوّل کچھ مختصر ریمارکس کئے ہیں پھر اسکا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُنکی جا بجا شرح بھی کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں محاسنِ کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں خاصکر ان لوگوں کے لیے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جسقدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لیے گئے ہیں اور جو اُن سے پست درجے

کے خیالات تھے وہ چھوڑ دے گئے ہیں، نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُنکی فہم سے بعید تر نہ ہو، اور باوجود اسکے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہئے کئی فائدے تصور کئے گئے ہیں ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اُسکا عمدہ مذاق رکھتے ہیں، انکو بغیر اسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا ملجائیگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بسبب اسکے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کر دئے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوت متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا، اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا کرنیکی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں مرزا کی زندگی کے واقعات جہاں تک کہ معلوم ہو سکے۔ اور انکے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ انھیں حالات کے ضمن میں اُنکی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں اور انکے لطائف و نوادر۔ جنسے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور اُنکی امیجینیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب، اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو، اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُنکی طرز شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے۔

جسکو ساری کتاب کا لُب لباب سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرفی سے حاصل ہونے چاہییں۔ لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کیجائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتد بہ فائدہ نہ پہونچا ہو۔ لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرہ میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، اُنکے ورکس میں چھان بین کرنی اور اُنکے نوادر افکار سے مستفید ہونا، قوم کے ان فرائض میں سے ہے جنسے غافل رہنا قوم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائی قدرۂ ایزدی نگشتند، و ازیں نمایشہائے نظر فروز۔ کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام۔ سرگراں گزشتند"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

تاریخ ولادت | مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب سنہ ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔

خاندان | مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال، جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے۔ یہ ہے کہ انکے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور انکا سلسلۂ نسب تورا بن فریدوں تک پہونچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا، تو ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی، مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی، کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ ہمارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ بدلی اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشائے کوچک) پر حکمراں رہے، آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام ایک امیرزادے نے سمرقند میں بود و باش

اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں "از وا پسیان ایں قافلہ نیائے من، کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود۔ چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہند آمد" اور در فشس کاویانی میں اس طرح لکھا ہے "بالجملہ سلجوقیاں بعد زوال و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ ازان جملہ سلطان زادہ ترسم خان کہ ما از تخمۂ اویم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیائے من از سمرقند بہندوستان آمد"

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی، اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پچاسوکا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالہ تنخواہ میں مقرر کر دیا، اُنکے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں، ایک مرزا کے باپ **عبداللہ بیگ خاں** عرف **میرزا دولھا** اور دوسرے **نصراللہ بیگ خاں**

عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ **غلام حسین خاں کیدان** کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو کہ سرکار سیرٹھ[1] کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے، مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی، اور انکی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی، مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے **ایک مرزا اسداللہ خاں**، اور دوسرے **مرزا یوسف خاں** جو ایام شباب میں مجنون ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

---

[1] سرکار ملک کے اس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں، جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے، اوّل لکھنؤ میں جاکر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہونچے، اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، اور وہ واپس آگرہ میں چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی انکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا، وہاں پہنچتے ہی انکے گولی لگی اور وہیں انکا انتقال ہوگیا، اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ راجا بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گانوں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا، جو ایک مدت دراز تک جاری رہا، مرزا کے والد کی وفات کے بعد انکے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انکو پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی اور نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے، تو انھوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جنھے نواب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں، سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرایا۔ انکی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا، جو نواح آگرہ میں واقع ہیں، سرکار سے انکے نام پر مقرر ہوگئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے ان کے نامزد رہے، اور انکی وفات

سلہ مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیو دھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

دریغ سالگی شدہ ام چاکر حضور — رنگین سخن چو ازم و دیرین فلیفہ خوار — دارم بگوش حلقہ زینجاہ ہشت سال
اکنوں کہ عمر شصت بسر سالہ شمار — باید شنید راز عیان بارگاہ — باید شنفت قصہ زپیران آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرورتیست — در خاک آج گڑھ چہ پدرم را بود مزار

کے بعد انکے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کر دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پنشن پھر جاری ہو گئی، اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا، اسکے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے، چونکہ ان میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں اسلیے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں قطعہ

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیہ[۱] از جماعۂ اتراک — در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم

[۱] ایبک لغت ازرباب کے باپ کا نام ہے

ورز معنی سخن گزاردہ — خود چہ گویم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمنفسیم — ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست نیروزیم — بمعاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن گریم ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چون[۲] پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہر ما از دودۂ جم ست

میراث جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

رباعی

غالب بہ گہر زدودۂ زاد[1] ششم زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہدی زدم چنگ بشعر شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ہی میں رہے، اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک انکی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمز د تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا، میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی، اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ "مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھکو لوگ بے اُستاد کہتے تھے انکا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے" مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُسکے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اسکو بلفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد انکے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے

---

[1] زاد ششم افراسیاب کے دادا اور پشنگ کے باپ کا نام ہے۔ ۱۲

کہ مرزا کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسر آئی، اور کس قدر قلیل مدت اسکی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اسکی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسلیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے۔

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من ست　　گل جدا ناشدہ از شاخ بدامان من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

باخذ فیض ز مبدأ فروزم از اسلاف　　کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں درگاہ

ظہور من بجہاں در ہزار و بست و دو یست[1]　　ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

ملا عبدالصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُسکی مادری زبان اور اُسکی قوم کی مذہبی زبان تھی۔ عربی زبان کا بھی۔ جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔ بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اسکی صحبت بہت کم میسر آئی، مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق کامل، اور جامع اللسانین اُستاد کا ملجانا ان نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اُس کے فیض صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر ست، و اگر حاصل نہ شود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر" معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے حسن قابلیت اور حسن استعداد نے ملا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا "اے خواجہ عزیز چہ کسی"

---

[1] دو یست یعنی دو صد۔ اہل زبان اکثر دو کے لفظ کے ساتھ بجائے صد کے یست کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲

کہ بااین ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گذری" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گرا ور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنکو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اولیٰ تہ نشین کر دی تھیں

تاہل | چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اسلئے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعے میں اشارہ کیا ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں سات رجب ۱۲۲۵ھ سنہ ہجری کو انکا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے انکی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے۔

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑے املاک تھے وہ منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے مجھسے سنو! تمہارے پردادا عہد نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولدی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو کتیھم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار سے دعویٰ

کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ہیں، اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس ۱۹ بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُنکی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر اُنکا بہت دور نہ تھا اسواسطے جب چاہتے چلے جاتے تھے۔ پس ہمارے اور اُنکے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے اُسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اسکے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اُس سے آگے بڑھکر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیریں والا کہلاتا تھا اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا، اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

واصل خاں نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اگاہکر جمع کرواتا تھا۔ بھائی تم سنو تو سہی! تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لیے تھے اور زمیندارہ اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگذاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اسکا حال از روے تفصیل جلد مجھکو لکھو" اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے تھے، اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اللے اور تللوں میں بسر ہوا تھا۔

اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سُنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوشرو لوگوں میں شمار کیے جاتے

تھے۔ اور بوڑھاپے میں بھی جبکہ راقم نے پہلے ہی بار انکو دیکھا ہے حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُنکے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چیکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پانوں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

دلّی میں انکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے، اس تمام مدت میں اُنھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا، ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایے کے رہے تھے جب ایک مکان سے جی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا بخش خاں کے پھاٹک یا اسکے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جاکر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں اُنکا انتقال ہوا، حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں:-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطابع کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزاری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرایے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرایے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفر کلکتہ اظہار مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُسوقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے

بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُنکے متعلقوں اور وارثوں کے لئے جن میں مرزا اور انکے بھائی بھی شریک تھے جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جھرکہ پر محول کردی تھی جبتک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہونچے اور شادی بھی ہوگئی عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہوگیا، الاچار فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروزپور سے جسقدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اسقدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا، مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا، اُس کشمکش میں انکو اسکے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "ہنگامۂ دیوانگی برادر یکطرف و غوغاے وام خواہان یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب، و نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد و گیتی بدین روشنی روشنان در نظر تیرہ و تار شد، با لبے از سخن دوختہ و چشمی از نوش فروبستہ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی باخود گرفتم، و از بیداد روزگار نالان، و مینہ بردوم تیغ مالان بہ کلکتہ رسیدم"

غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی۔ جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے کلکتے میں لوگوں نے انکی بہت خاطر و مدارات کی اور ان کو کامیابی کی اُمید دلائی اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ انکے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا تھا کہ تمھارا حق ضرور تمکو ملیگا کول برک صاحب جو اسوقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں نے دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ

کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان اُمیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سرجان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور اُنھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ اُنھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جسقدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی اسکی مفصل کیفیت۔ جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی۔ گورنمنٹ میں بھیجدی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے ولایت میں اپیل کیا مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں، ایک تو یہی کہ اُنکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جسقدر کم پنشن ملتی رہی ہے اسکی داصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی اسلیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی۔ تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ سیالکوٹ قرار پائے وہ اور شرکا سے علحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانۂ سرکار میں منتقل ہو جائے تاکہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ یہ دونوں درخواستیں منظور ہوگئیں اور انکے موافق اب تک عملدرآمد رہا۔ پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے انکو خاں صاحب بہادر مہربان دوستاں لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلی میں وایسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو انکو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائد شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کے انکو برابر ملتا رہا۔ اور تمام لوکل حکام اور افسر اُن سے رئیس زادوں کی

طرح ملتے رہے۔

مجادلہ اہل کلکتہ کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکلجاتی ہے" اسی لئے وہ قتیل وواقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے قتیل کا نام سُنکر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ[1] فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش وخروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جز بز ہوتے تھے انکے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا انھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ باد مخالف جسمیں اپنے غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی ناقدردانی کی شکایت اور انکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کئے ہیں۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کئے جاتے ہیں

اے تماشائیان بزم سخن — وے مسیحا دمان نادرہ فن
اے گرانمایگان عالم حرف — خوش نشینان ایں بساطِ شگرف
اے سخن پروران کلکتہ — وے زباں آوران کلکتہ
ہر یکے صدر بزم بار گہے — شمع خلوت سرائے کار گہے

---

[1] مرزا قتیل تو مسلم تھے! اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دلوالی سنگھ تھا۔ اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے یہاں ان کی نہایت قدر ہوئی۔ ۱۲

هر یکے پیش تا زقافلۂ — هر یکے کتخدائے مرحلۂ
اے بہ شغل وکالت آمادہ — دادِ غم خوارِ جہاں دادہ
اے شگرفانِ عالمِ انصاف — بسفارت رسیدہ از اطراف
اے سخن را طراز جاں دادہ — صفحہ را ساز گلستان دادہ
عطر بر مغز گیتی افشانان — پہلوانان پہلوی دانان
اے گرامی فنان ریختہ گو — نغز دریا کشان عربدہ جو
اے رئیسان این سوادِ عظیم — دے فراہم شدہ ہیفت اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ این شہر — بہ کارے رسیدۂ این شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ — درخم و پیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست — بے سخن ریزہ چین خوانِ شماست
بہ تظلم رسیدہ است اینجا — بامید آرمیدہ است اینجا
آرمیدن دہید روزے چار — خستہ را بہ سایۂ دیوار
کار احباب ساختن رسمست — میہمان را نواختن رسمست
آں رہ و رسم کارسازی کو — شیوۂ میہمان نوازی کو
کیستم؟ دل شکستہ غمزدۂ — بیدلے خستۂ ستم زدہ
برق بیطاقتی بجان زدۂ — آتشِ غم بجانمان زدہ
از گداز نفس بتاب و تبے — در بیابانِ یاس تشنہ لبے
خس طوفانیِ محیط بلا — سر بسر گردِ کاروان فنا
دردمندے جگر گداختۂ — از غمِ دہر زہرہ باختۂ
در آگاہیِ فنا زدہ — ہمہ بر خویش پشت پازدۂ
چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر — کہ بہ اینجا رسیدہ ام آخر

بہ سیہ روز غربتم بینید
تیرہ شہلائے وحشتم بینید

اندہ دوری وطن نگرید
غم ہجران انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغان بلبم
من و جان آفرین کہ جان بلبم

مویہ چون سوے کردہ ست مرا
غصہ بدخوے کردہ است مرا

ذوق شعر و سخن کجاست مرا
کے زبان سخن سراست مرا

دارم آرے زہرزہ لائی خویش
نوحہ بر خویش و مبنوائی خویش

گردش روزگار خویشتنم
حیرت کار و بار خویشتنم

با من این خشم و کین!! دریغ دریغ
من چناں تاں چنیں!! دریغ دریغ

بر غریباں کجا رواست ستم
رحم اگر نیست خود چرا ست ستم

بندہ ام بندہ مہرباناں را
رمز فہمان و نکتہ داناں را

نہ ز آویزش بیاں ترسم
من و ایماں من کزاں ترسم

کہ پس از من بسالہائے دراز
بہ زبان ماند ایں حکایت باز

کہ سفیہے رسید بود اینجا
چند روز آرمیدہ بود اینجا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت
زحمتے داد و راہ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود
بیحیائے و ہرزہ گوئے بود

ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت
ہم خرابا تیانہ ہوئے داشت

برگ دنیا نہ ساز دینش بود
ننگ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ بعد رفتن من
خون دہلی بود بگردن من

تا بوم رنج دوستاں باشم
بر دل انجمن گراں باشم

شاد گردند کرمیاں بروم
آدخ از من کہ من چناں بروم

خستہ و مستمند بر گردم — وز رہم آیم نژند بر گردم
بود اعم کس از شما نرسد — شوق را مژدۂ وفا نرسد
دوستاں را اگر زمن گلہ است — کہ خراست خلاف قافلہ است
می رویم از پے قتیل ہمہ — ساختہ مرد را دلیل ہمہ
تو ازیں حلقہ چوں بدر زدۂ — گام بر جادۂ دگر زدۂ ؟
اے تماشائیان ژرف نگاہ — ہاں بگوئید حستہ للہ
کہ چساں از حزیں نہ پیچیم سر — آں بجا دو دمے بہ دہر سمر
دل دہد[1] کز اسیر بر گردم — زاں نوآئیں صغیر بر گردم
دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را — آں ظہوری جہان معنی را
آنکہ از سرفرازی قلمش — آسماں ساست پرچم علمش
طرز اندیشہ آفریدۂ اوست — در تن لفظ جاں دمیدۂ اوست
پشت معنی قوی ز پہلویش — خامہ را فربہی ز بازویش
طرز تحریر رالوے ازوے — صفحہ ارتنگ مالوی ازوے
فتنۂ گفتگوے اینانم — مست لالے سبوے اینانم
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل واقف را
لیک با ایں ہمہ کہ ایں دارم — گنج معنی در آستیں دارم
دل و جانم فدائے احبا بست — شوق وقف رضای احبا بست
میشوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نوائے مدح قتیل

---

[1] یعنی آیا دل اجازت میدہد کہ از اسیر برگردم یہ اہل زبان کا محاورہ ہے کہ دل دہد بجائے "دل بہتوری دہد" کے بولتے ہیں۔

تا نماند زمن دگر گلۂ ؟ رسد از پیروان و سے صلۂ
گفتن آئین ہو شیاری نیست لیک دانستن اختیاری نیست
گرچہ ایر انیش نخواہم گفت سعدیِ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بارہ است از من و ہیچو من ہزارہ است
من کفِ خاک او سپہر بلند خاک را کے رسد بچرخ کمند
وصف او حدِ چوں منی نہ بود مہر ور خوردِ روزنے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیانی او ہبذا شور نکتہ دانی او
نظمش آب حیات را ماند در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است انتخاب صراح و قاموس است
پادشاہے کہ در قلمرو حرف کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوے پارسی دانش ہندیاں سر بخطِ فرمانش
ایں رقمہا کہ ریخت کلک خیال بود سطرے زنامۂ اعمال ؛
از من نارسائے ہیچمداں ؛ معذرت نامہ ایست زی یاراں
بوکہ آید زعذر خواہیِ ما رحم بر ما و بیگناہی ما
آشتی نامہ و داد و پیام ختم شد والسلام والاکرام

قیام لکھنؤ جب مرزا نے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اسوقت راہ میں ٹھہرنیکا قصد نہ تھا مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اسلئے کانپور پہنچکر انکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شایستہ انکی تقریب کی گئی۔

مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا، مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں جو انکے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھکر ایک دوست کے توسط سے گزرانا تھا۔ اور اُس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دیکر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیجدو۔ مرزا صاحب نے یہ سنکر کچھ کچھ تحریک کی مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیر الدین حیدر مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی، اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے مقرر ہو گئے لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی، اور وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔

لطیفہ | لکھنؤ کی ایک صحبت میں جبکہ مرزا وہاں موجود تھے۔ ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں، آپ کی رائے میں فصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، تو سخت مشکل واقع ہوگی، میں تو اپنی نسبت کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سنکر پھڑک گئے۔ مرزا کا مطلب

صرف اسقدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے، اگر متکلم کے لئے بھی اسکا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس واقع ہوگا۔ اس مطلب کو انھوں نے اس لطیف پیرائے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں، اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں، کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مونث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

ملازمت سرکاری سے انکار تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی میں آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے۔ اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی صدر الدین خاں کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہونچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، انھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری انکے لینے کو آئینگے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اسلئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اسلئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم

قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھکو اس خدمت سے معاف رکھا جائے، اور یہ کہکر چلے آئے۔

قید ہونیکا واقعہ مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ مرزا نے خود اس واقعے کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جسکا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بنگیا اور میری قید کا حکم صادر کردیا۔ سشن جج۔ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اُس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر نہ معلوم کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اسکی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ عدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اُسکو مطلع کیا، یہانتک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا۔ جو کچھ گزرا اسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنیوالا ہے اُس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں، اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے، دیکھئے وہ

وقت کب آئیگا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اسکے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں - یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جسکا میں آرزومند ہوں"

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا - اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو انکو قید خانے میں گزرے انکو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی، وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ گھر سے انکو پہنچتی تھیں انکے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے - اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیلخانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے - مگر چونکہ اسوقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اسلیے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے - چنانچہ جو ترکیب بند انھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اُس میں کہتے ہیں:-

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست — بہر آزار غم از قید فرنگم نہ بود
جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن — طعن احباب کم از زخم خدنگم نہ بود

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر انکی غمخواری اور ہر طرح کی خبر گیری میں مصروف رہے - چنانچہ اسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں:-

خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخواری من — رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار منست
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار منست

لطیفہ | جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے[1] صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی، مرزا نے کہا کون بکھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسب حال لکھکر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اُس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیات فارسی میں اس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا، مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ "سید چین" شائع کیا تھا، اُس میں اس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن سید چین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی، اس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہے۔ چونکہ یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اس واسطے اسکے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:-

از بند اول

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم — غم دل پردہ دری کرد۔ فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
چوں سرایم سخن انصاف زمجرم خواہم — چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم
بار دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کاینجا — آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
اہل زنداں بہ سر و چشم خودم جا دادند — تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
ہلہ دزدان گرفتار! وفا نیست بشہر — خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم

---

[1] حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخر الدین قدس سرہ کے پوتے تھے مرزا مدت تک انکے مکان میں رہے ہیں وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا۔ ۱۲

از بند سوم

پاسبانان بهم آئید که من می آیم — در زندان بکشائید که من می آیم
هر که دیدے بدر خویش سپاسم گفتے — خیر مقدم بسرائید که من می آیم
جادہ نشناسم و ابنوہ شمامی ترسم — راہم از دور نمائید که من می آیم
رہرو جادۂ تسلیم درشتی نکنند — سخت گیرندہ چرائید که من می آیم
ہاں عزیزاں که دریں کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید که من می آیم
تا بدروازۂ زندان پے آوردن من — قدمے رنجہ نمائید که من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئین من ست — بہرہ از من بربائید که من می آیم

از بند چہارم

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جہت قبلہ برآمد گوئی
دل و دستے که مرا بود فرو ماند از کار — شب و روز یکه مرا بود سر آمد گوئی
بہرۂ اہل جہاں چوں ز جہاں درد و غم ست — بہرہ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی
[illegible]ستن و بستن من حد عمس نیست — بر من ایں ساز قضا وقدر آمد گوئی
[illegible]م رانه توان کرد به خستن ضائع — خستگی غازۂ روے ہنر آمد گوئی
[illegible]ح یک مرد گرا نمایه به زندان خواہد — یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

از بند ہفتم

ہمدماں! در دلم از دیده نمائید ہمه — غالب غمزده را روح در وانید ہمه
للہ الحمد که در عیش و نشاطید ہمه — للہ الشکر که با شوکت و شانید ہمه
من بخوں خفته و بینم همه بینید ہمه — من جگر خسته و دانم همه دانید ہمه
در میاں ضابطۂ مہر و وفائی بود ست — من برانیم که ہر آئینه برانید ہمه
روزے از مہر نگفتید فلانی چون ست — بارے از لطف بگوئید چسانید ہمه

چارۂ گر نتواں کرد دعاے کافیست　　دل اگر نیست خداوند زبانیدہمہ
ہفت بند ست کہ در بند رقم ساختہ ام　　بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ بہر بزم زمن یاد آرید
دارم اُمید کہ در بزم سخن یاد آرید

قلعہ کا تعلق ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا کے حوالے کیا کریں، اور مرزا اُن تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں پر تقسیم کیجائے پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتداے آفرینش سے صاحبقراں تیمور گورگان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانہ تک بیان کئے جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جائیں۔

مہر نیم روز ماہ نیم ماہ مرزا نے تمام کتاب کا نام پرتوستان اور اسکے پہلے حصے کا نام مہر نیم روز اور دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ انکو اپنی دو ایجادوں پر ناز تھا، ایک ماہ نیم ماہ اور دوسرے رستخیز بیجا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہ چہاردہ اور ماہ دوہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصہ

لہ رستخیز بیجا۔ غدر کی تاریخ کا مادہ ہے اسمیں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۴ میں سے جاکے صد یعنی (۴) کا تخرجہ کیا ہے۔ ۱۲

یعنی ماہِ نیم ماہ - بالکل نہیں لکھا گیا - مہرِ نیمروز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہوگیا اور اُس حصے کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہِ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اسکے جواب میں لکھتے ہیں ماہِ نیم ماہ اسمیست کہ مسمّی ندارد، چوں از سرِ نوشت گردن نتوان پیچید سرگزشت باز کویم، ہرگاہ ایک نیمہ از پرستان انجام یافت دہر نیمروز نام یافت لختی درنگ و رزیدہ شد، تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کار فرما را روز فرو رفت، و روزگار سر آمد، و دولت دیرینۂ ترکمانانِ قراچاریۂ سپری گشت، ماہِ نیم ماہ ہمچوں ماہ بست و ہشت شبۂ ناپدیدار، و نامش بعنوان بے نشانی در مہرِ نیمروز آشکار ماند۔"

خدمت اصلاح اشعار بادشاہ

۱۲۷۱ھ میں جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے، ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اسکو کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے۔ اور اُسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں، اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھکر چوبدار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں انکو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیگر درست کردے۔ جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی

کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبکدوشی ہوئی ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرز خاص میں لکھتے تھے۔ نظم ہو یا نثر۔ اسکو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے چنانچہ خود انھوں نے جا بجا اسکی تصریح کی ہے۔ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اُس وقت انکو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

بدیہہ گوئی ۱۸۱۷ء میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی مرزا نے کہا فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے" اس پر بات بڑھی۔ اُس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً پڑھا تھا۔ مرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہ کہہ سکتے ہیں" مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکالکر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موڑوں کرکے پڑھ دیا جو ان کے دیوان مدیختہ میں موجود ہے اور جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی　　زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیئے

اولاد مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی ابتدا میں سات بچے پیدا ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا اسلئے ایک مدت سے وہ اور انکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے مگر غدر سے چند سال پہلے۔ جبکہ انکی بی بی کے بھائی زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوگیا، اور انکے دونوں بچے ایک باقر علی خاں اور دوسرے

حسین علی خاں صغیر سن رہ گئے۔ تو مرزا اور انکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اسوقت بہت کم عمر تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علی خاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھکر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیکخو اور نہایت شریف مزاج تھے مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہوگئے

عارف کا مرثیہ زین العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ اور باوجود پرگوئی کے نہایت خوشگو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے جب وہ جوان عمر میں فوت ہوگئے تو مرزا اور انکی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے انکے مرنے پر ایک غزل بطور نوحے کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اسکے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گیے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شب چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حالات غدر غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جوہیں بغاوت کا فتنہ اُٹھا اُنھوں نے دروازہ بند کر لیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور انکے ہمسایوں کے مکان پر جسمیں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اسلئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے، مگر پھر انکو طرح طرح کی کلفتیں اُٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور آخر دم تک اسی حالت میں رہے، جب مرزا نے دلی میں سکونت اختیار کی تو انکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے انکا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز دونوں عمر رسیدہ تھے۔ انکے پاس رہتے تھے۔ جب دلی فتح ہو گئی اور شہر اہل دہلی سے خالی ہو گیا، اور رستے بند ہو گئے اُسوقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان، مند لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے، پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتہ تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا، مگر مرزا کے ہمسایوں نے انکی بڑی مدد کی۔ پٹیالے کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا، اور مرزا

صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں جو مکان کے قریب تھی دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں:

دریغ آں کہ اندر درنگ سہ بیست[1] سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہ خاک بالیں زخشتش نہ بود بجز خاک در سر نوشتش نہ بود
خدایا بریں مردہ بخشائشے کہ نادیدہ در زیست آسائشے
سروشے بہ دلجوئی او فرست روانش بجاوید مینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:

زسال مرگ ستمدیدہ میرزا یوسف کہ زیستے بجہاں در زخویش بیگانہ

یکی در انجمن از من ہمی پژوہش کرد کہ کشیدم آہے و گفتم دریغ دیوانہ

اس میں لفظ آہے کا تخرجہ دریغ دیوانہ میں سے کیا ہے۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے، راجے کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر انھوں نے کچھ التفات نہیں کیا مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل برون کے روبرو۔ جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے لے گئے کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہمکو رخصت کر دیا۔

لطیفہ: سنا ہے کہ جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پیاخ انکے سر پر تھی۔ انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟

---

[1] بیست یعنی ساٹھ۔ دوسرے مصرعہ میں سہ دہ سے مراد تیس ہے۔ ۱۲

مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا اسکا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا" کرنیل یہ سنکر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چھٹی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدہ کی رسید اور جواب میں آئی تھی دکھائی۔ کرنیل نے کہا کہ تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور انکے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

اس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں کہ سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش ذلت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔ میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرینچ کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی، اگر جوانمرد، خدا دوست، خدا شناس، دریا دل مہیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرینچ سے مشابہ، اور بو میں اُس سے بہتر تھی مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا۔ اسکے بعد یہ رباعی لکھی ہے۔

رباعی

ازدیر دلم دایہ زہر درمی جست — از بادۂ ناب یک دو ساغرمی جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بمن — آبے کہ ببرائے خود سکندرمی جست

چونکہ اُسوقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا، مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا جو اُن کے پاس برابر آتے رہتے تھے، اور ہر طرح سے انکی مخواری کرتے تھے۔ کوئی اُنکا غمخوار نہیں رہا تھا۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے، سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ، سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہو گئے تھے شہر کے تمام مسلمان ما

لہ فرینچ وہ چیز ہو فرانس سے منسوب ہو اور یہاں اُس سے فرانس کی شراب مراد ہے۔

جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے۔ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اسکے سوا گھر میں جسقدر بی بی کے پاس زیور یا اور کوئی قیمتی چیز تھی، جب شہر لٹنے لگا تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیجدیا، جہاں۔ ے تمند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا اور جو حالت آن پر اور انکے متعلقین پر خوش و ناخوش گزری اس میں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار انکی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "اس ناداری کے زمانے میں جسقدر کپڑا، اوڑھنا، اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ اسکے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ اس بازیچۂ اطفال یعنی کتاب دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کیجائے؟ جو حالت کہ اسوقت درپیش ہے ظاہر ہے، کہ اسکا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا، پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسا کچھ مل گیا پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اسمیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا، اور نہ ملی تو تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جاکر بسرام کرنا پڑیگا

وظیفہ رامپور غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا

کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو نواب کلب علیخاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی۔

لطیفہ جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لیے رامپور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا انکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"

قاطع برہان جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا۔ اسوقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں۔ مرزا پاس اُس وقت سوائے برہان قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی برہان کو اُٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا شعرا نے جو الفاظ مجاز و کنایے کے استعمال کیے ہیں ان کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابل اعتراض نظر آئے انکو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جس کا نام **قاطع برہان** رکھا گیا اور ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شایع ہوگئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں باضافہ دیگر

مضامین و قواعد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اسکا نام درفش کاویانی رکھا
یہاں دو چار مثالیں اُن الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر
مرزا نے صاحبِ برہان کا تخطیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحب برہان نے عنبر ارزاں
کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ اسکو عنبر لرزاں
بھی کہتے ہیں، مرزا صاحب برہان کی غلطی کا منشا یہ بتلاتے ہیں کہ اُس نے
نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو نعت میں ہے "بوے کزاں عنبر لرزاں وہی ✤ گرد رہ
عالم وہی ارزاں وہی۔ پس عنبر لرزاں میں استعارے کو اصلی لغت قرار
دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقعے اور محل کو بالکل نہیں سمجھا
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زلف عنبر بو جو دونوں جہاں کے بدلے
میں بھی ارزاں ہو اسکا نام عنبر ارزاں رکھدیا۔ یا مثلاً برہان میں لکھا ہے
"قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدن پیغمبر
باشد" اول تو قافلہ شد کو ایک لغت قرار دینا بیمعنی ہے۔ پھر اسکے معنی قافلہ
سالار رفت کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفاتِ سرورِ کائنات مراد لینا
غلط در غلط اور خبط در خبط ہے۔ مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اس شعر
کو بتاتے ہیں ؎ قافلہ شد واپسی ما بنگر ✤ اے کس ما بیکسی ما بنگر یہ شعر
مخزن اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سہو سے اسکو جامی کی
طرف منسوب کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور
ساتھی سب چلدیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار مددگار نہیں ہے یا مثلاً
صاحب برہان لکھتا ہے "شش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر در باشد و
کنایہ از مشک و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہا ہم ہست و بحذف ضرب
ہم بنظر آمدہ کہ شش نتیجہ خوب باشد" مرزا نے جو اسکا خاکہ اُڑایا ہے وہ

طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور بمعنی جملے کو لغت قرار دینا صاحب برہان ہی کا کام ہے۔ اور اس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح کی لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفش کاویانی کو اول سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔

جسوقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اسوقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ انھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور ذوق وجدان کی شہادت سے لکھا یا اسمیں چند مقامات کے سوا جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے اور بعض غلطیوں کا انھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے، انکے تمام ایرادات واجبی معلوم ہوتے ہیں البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتہ کی مصحح و مطبوعہ برہان مرزا کے پیش نظر تھی۔

قاطع بُرہان کی مخالفت اور اسکی وجہ

اس کتاب کا شایع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں مخرق قاطع قاطع قاطع، موید برہان، سراج منیر برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔ مخالفت کی وجہ ظاہر ہے تقلید نہ صرف امور مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہوگئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر

کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے ممکن نہ تھا کہ انکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیجاتی
بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مرزا نے جواز راہ شوخی طبع کے صاحب برہان
کا جابجا خاکہ اُڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ ناملائم بھی غیظ و غضب میں انکے قلم
سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اسوجہ سے مخالفت ہوئی، مگر یہ خیال صحیح نہیں
ہے۔ اگر مرزا۔ صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت
ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت
کس مپرس حالت میں ہیں انکے لئے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع
اسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں
اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔
جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب انکو سرسری نظر سے
دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک
مجیب برہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحب برہان نے لغت کی
تحقیق کی ہے۔ اس طرح فرہنگ جہانگیری یا فرہنگ رشیدی یا سراج اللغات
یا موید الفضلاء یا ہفت قلزم یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے اور اس سے
بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب
یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی
ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسی کا تتبع
کیا ہے تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

قاطع برہان کی تائید

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے
۱۲۸۸ھ یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت
کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جو فرہنگ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور

مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغات کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بہرحال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ تر معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُس نے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگِ رشیدی اور برہان قاطع، تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اسکے بعد ایک باب میں صرف برہان قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا۔ یا چکاک کے تین معنی ہیں پیشانی قبالہ نویس، اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اسکو برہان میں لکھا ہے "قریہ ایست از قرائے عالم یہاں ازراہ طنز صاحبِ فرہنگ ناصری لکھتا ہے "فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحب برہان کی اس باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جابجا اُسکا تخطیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کیے ہیں، اُنکی بھی جابجا فرہنگ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ از انجملہ لفظ آبچیں، استخر و اصطخر، جمدر، باختر، راوش، زاوش، کارکیا، دیزہ و اویزہ، اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بمعنی اور مہمل بتایا ہے، رضا قلی خاں بھی اسکو مہمل بتاتا ہے مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحب برہان لکھتا ہے "ہر چیزے فراش خیال جاروب سنبل برحل خرسک دیش زنداز پوست آں پاک نتواند" مرزا اس کی نسبت لکھتے ہیں "فقرۂ اخیر مگر کلام دیوانست؟ ہرگاہ خوبیِ تحقیق چناں وحسن

عبارت چنیں باشد مقصود اصلی کہ معلوم کردن مجہولات است از برہان قاطع چگونہ حاصل تواں کرد" رضا قلی خاں از راہ طنز اسی فقرہ پر یہ لکھتا ہے "دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیان بلیغ زادہ طبع ایشان بودہ۔ برہان ذوق سلیم و سلیقہ مستقیم صاحب برہان خود ہمین عبارات بس است، تا ازیں پس از وچہ آید" اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کرکے اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایت ہند کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیح لغات فارسی کے توانند" ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو کہ ایرانی ہے) کا قول برہان قاطع کے باب مین نقل کرتا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ "برہان قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں، اُن پر اعتبار نکرنا چاہیے۔ اسمیں کنایات کو بھی علیحدہ لغت قرار دیتا ہے اور سریانی و عبرانی و ترکی و زند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں تطویل لاطائل کرتا ہے" اسکے بعد رضا قلی خاں صاحب برہان جامع کی تصدیق، اور اسکے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان ہیزہ معلوم ہوگا اسلیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں جسکو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگ ناصری کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کیے ہیں خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اسکو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسف قرار دیا ہے۔ اور اس غلطی کا انھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے اور ممکن ہے کہ اسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس

طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ فی الواقع فارسی زبان سے انکو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے کہ انھوں نے محض اپنے وجدان سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے محققوں نے اسکی نسبت ظاہر کی ہے، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں وہ اور انکے سوا اور بیشمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اس میں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

مرزا نے قاطع برہان کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں، ان میں سے فائدہ اول کا ماحصل یہ ہے کہ ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اسلئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہوکر اور ہندوستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعوی کرنا بیمعنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا تو ران سے آیا تھا اور میرا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہل زبان سمجھتا ہوں میں بلاشبہہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے، جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اسوجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد کے فیض صحبت سے جو مجھکو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اس سے تربیت پائی، اور باون برس مشق سخن کی، اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھپر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شان ایزدی کی شناخت سے محروم رہے، اور میری نظم و نثر کے گرشموں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا گویا انگلیری جنت

آرامگاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی بہ مسیح باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

جتنے آدمیوں نے قاطع برہان کے جواب لکھے ہیں ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں، اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخی طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں انکے طرز بیان کا خاکہ اڑایا ہے کہیں انکی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے

لطیفہ مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اسکے لات مارو گے؟

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطن کلکتہ، جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے جسکے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لیے چھان مارا۔ اور مثل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا اور جو سب الفاظ مرزا نے صاحب برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تعریفیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اسکے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ تیغ تیز لکھا ہے، اور ایک فارسی قطعہ بھی انکو لکھکر بھیجا ہے جسکے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ را از اصفہانی بودن آباچہ سود خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

با قتیل و جامع برہان و لالہ ٹیک چند لابہ[1] و سوگیری[2] و لطف و مدارا کردہ است

---

[1] لابہ خوشامد [2] سوگیری طرفداری

داوری[1] گاہی بنا فرمود و در وی ہر سہ را — منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کردہ است
گر چنیں با ہندیاں دارد لو لا در سخن؟ — من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است
مطلب از بد گفتن من چیست؟ گویا نیک مرد — مزد ایں کار از حق آمرزش تمنا کردہ است
صاحب علم و ادب! وگر زا فراط غضب — چوں سفیہاں دفتر تقریر وذم وا کردہ است
در جدل دشنام کار سوقیاں باشد بلے! — ننگ دار د علم از کارے کہ آغا کردہ است
انتقام جامع برہان قاطع می کشد — آنچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است
من سیاہی زادہ ام گفتار من باید درشت — وائے بر وے گر بتقلید من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک داد بذلہ سنجی دادہ ام — شوخی طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است
میکند تائید برہاں لیک برہاں ناپدید — نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انشا کردہ است
سستی طرز خرام خامۂ برہاں نگار — یا نمید انست یا دانستہ اخفا کردہ است
بہر من توہین و بہر خویش تحسیں جا بجا — ہم مرا ہم خویش را، در دہر رسوا کردہ است
یافتم از دیدں تاریخہائے آن کتاب — خود بدم گفت و با حباب خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہ خویش آورد از بہر جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اسکے متعلق مرزا کی جسقدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و نکات بھی درج ہیں۔

لطیفہ لفظ فراز کو صاحب برہان اضداد میں گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونوں بتاتا ہے۔ مگر مرزا اسکو اضداد میں سے نہیں گنتے، بلکہ بلکہ اسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں، اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کئے ہیں مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔ مگر چونکہ

[1] داوری گاہ محکمہ۔ ۱۲

ہندوستان کے تمام فرہنگ نگاروں نے **فراز** کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ اسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ "اسکو امر اجماعی قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اسلام نے خلافت یزید پر اجماع کیا تھا"

لطیفہ صاحب برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں "خدا پرستان! از بہر خدا ایں عربی مفہم فارسی مدان (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کہ کیفیت؛ می پرسم کہ چیست؟ ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں "چوں شناسائی حقیقت جوہر لفظ ندارد فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت رسن می تافت، ہیزم می فروخت گلخن می افروخت"

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا تھا، اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالہ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی، مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ اُنھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

لطیفہ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

بہر چہ در نگری جز بجنس مائل نیست — عیار بیکسی من شرافت نسبی[1] است

گمنام خطوں میں گالیاں جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا، ایک مدت کے

---

[1] یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ چونکہ شرافت نسبی میں کوئی میرا ہمجنس نہیں ہے اسلئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا۔ ۱۲

بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب وشتم بھیجنے شروع کیے۔ جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن وملامت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں میں مرزا کی عجیب حالت تھی نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔ اور جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو۔ اس خیال سے کہ مبادا کوئی اس قسم کا خط نہ آیا ہو۔ انکا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔

راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ

اتفاق سے انھیں دنوں میں نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا۔ چونکہ مجھکو ان نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا، ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جسکے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشہ میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہل سنت کو اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم وصلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمت الٰہی کو کون وکثورۃ کی وسعت سلطنت سے بھی۔ جس میں ہر مذہب وملت کے آدمی بہ امن وامان زندگی بسر کرتے ہیں۔ زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لئے ہمیشہ انکی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا انکا ساتھ چھوٹ جائیگا؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی، استادی اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو

نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ انکا تثقل سماعت انتہا کے درجے کو پہونچگیا تھا، اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعہ سے کیجاتی تھی۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھکر انکے سامنے پیش کیا۔ جس میں اُن سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہوکر، یا بیٹھکر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری۔ اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اسوجہ سے کہ انھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں انکے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے، اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ اُنھوں نے کہا "ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں، اب اگر چند روز بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسّی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر لیجاکر کتّوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں "لا الٰہ الا اللہ" "لا موجود الا اللہ" "لا موثر فی الوجود الا اللہ"۔

لطیفہ۔ شاید اُسی روز۔ جبکہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے چٹھی رساں نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے انکو

یقین ہوگیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اسکو کھولکر پڑھو۔ میں خود دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اسکے اظہار میں تامل ہوا فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی مسکرا کر کہنے لگے کہ اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اسکو غیرت آئے۔ جواں کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اُس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں، کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا؟

اسکے بعد میں اُن سے رخصت ہوکر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے۔

بمقصدے کہ مرآں راہ خدا گویند — برو بروکہ ازاں سو بیا بیا گویند
کسیکہ پائے ندارد چگونہ راہ رود — خود اہل شرع دریں وادی چہا گویند
زرمز نحل انا اللہ گوے نا آگاہ — حدیث جلوہ گہ و موسی و عصا گویند
مگر زحق نہ بود شرم حق پرستاں را — کہ نام حق نبرند و ہمیں انا گویند
زقول غماں نہ بود دل نشین اہل نظر — جزآں صفات کہ از ذات کبریا گویند
نخواندہ درکتب و ناشنیدہ از فقہا — بغیر بے مزہ واگو یہ ہا کہ واگویند

دمِ از وجود[1] زدند نجیبان — چہ ساں عطیۂ حق را گناہِ ما گویند
بلے! گناہ بود دعوی وجود از ما — با ہل راز چنیں گوی تا بجا گویند
دگر ملامتیاں را چہ زہرۂ پاسخ — اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند
نکردہ زر مس خود را و بہر عرض قریب — بہ پیش خلق حکایت ز کیمیا گویند
کساں کہ دعوی نیکی ہمی کنند۔ مرا — اگر نہ نیک شمارند۔ بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطاب مولانا — بس است ہجو تولیٰ را کہ پارسا گویند
بگوی مردہ کہ در دہر کارِ غالبِ زار — ازاں گزشت کہ درویش و بینوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنوں خاطر ہیں، اور کبھی انکے اظہار کی نوبت نہیں آئی انکو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعے میں بیاں کیا جائے۔ چنانچہ قطعہ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم بشکست — ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی — چہ بذلہ ہا کہ بانداز دل ربا گفتی
رسید نشۂ عرفاں چو ذکرِ مے راندی — شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

---

[1] یہ ایک مشہور قول صوفیہ کرام کا ہے میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اس میں ایک موقعہ پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا مرزا اسپر اعتراض کرتے ہیں اور اسکو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ وجود ایک عطیۂ الٰہی ہے پس اسکو ہمارا گناہ کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ البتہ دعوی وجود گناہ ہے۔ اگر اہل راز سے اس طرح کہا جائے تو وہ تسلیم کرسکتے ہیں مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجود کہ ذنب" وہ ایک وجود واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وحدت وجود انکا اصل اصول ہے۔ پس انکے نزدیک وجود ما سوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیال انسانی کے مخترعات میں سے ہے اسلئے وہ کہتے ہیں کہ وجود کہ ذنب" ۱۲

دویدریشہ بدلہا چو حرف مہر زدی — دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی
گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی — اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی
ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی — ہزار نکتۂ پوشیدہ برملا گفتی
ز سرِ تفرقۂ جمع قصہ ہا راندی — ز سیر انفس و آفاق راز ہا گفتی
برآمد از دلِ بیگانگان ترانۂ ذوق — بہ محفلے کہ سنہائے آشنا گفتی
لطیفہا کہ بلفظ و بیاں نمی گنجید — توچوں فرشتہ زغیب آمدی و وا گفتی
بحق لطف کلامت کہ ہست بر دل ما — کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی
تو اے کہ ہر سخن نغز تو بدل جا کرد — جز آں کہ در حق حالی بہ رمز وا گفتی
ہر آنچہ گفتۂ اندر جواب عرض نیاز — خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی
ولے بعد بدہ از حرف چند با خویشم — کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی
عجب کہ قاعدہ دانِ نیاز مندی را — سفیہ و معجب و خود بین و خود نما گفتی
عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را — رہینِ ذوق نوا سنجیِ انا گفتی
عجب کہ منفعلے راز نقد نامزدہ اش — بہ رزق در گرو عرض کیمیا گفتی
نہ راہ حرف بسویت نہ جاے من بدلت — جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی
اگر نہ روے سخن با تو بود می گفتم — چگونہ گفتی: و چون گفتی؟ و چرا گفتی
ولیک شرط ادب نیست بر تو خردہ گرفت — ہر آنچہ دردہ حق من گفتۂ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفےٰ خان مرحوم متخلص بہ شیفتہ وحسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلّی آئے ہوئے تھے، اور میں اُنھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتۂ وحسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امید وار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — بداں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ — دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعے کا ذکر چھڑ گیا ہے اسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر انکی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادۂ بسوے رہی — سزد کہ جان گرامی بداں نثار کنم
شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاص — گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں — اساس دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضای دوستی نہ بود — زغیر شکر و شکایت زدوستدار کنم
سرشت پاک و دل صاف دادہ اند مرا — بحرف تلخ و لے خالی از غبار کنم
خوش آنکہ ساز کنم از تو شکوۂ بیجا — تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوش آنکہ عذر تو چوں در کند مرا بہ زبیں — دگر بہ پیش تو تمہید اعتذار کنم
بداں سرم کہ اگر مرگ امان دہد زیں پس — زکار ہائے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم
زکردہ توبہ نمایم زگفتہ استغفار — وگر سپاس تو پنہاں و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا اس پر یہ لکھکر کہ "بس اب بیت بخشی موقوف" میرے پاس بھیجدیا۔ اسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

استعداد عربی | مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا، مگر چونکہ علم لسان سے انکو فطری مناسبت تھی انکی نظم و نثر اُردو فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فن ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو انھوں نے ہر جگہ اسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔

فارسی دانی | شاعری جسکا ملکہ انکی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اسقدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی سنتنی آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔

عروض | اسکے سوا فن عروض میں بھی انکو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جن کے وزن اور قول کا اندازہ صرف استقامت طبع سے ہوسکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کرسکتے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات + شعر میگویم بہ از قند و نبات" + مرزا کا ایسا حال نہ تھا چنانچہ فارسی اُردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں انھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے۔

نجوم | علم نجوم سے کسی قدر، اور اُسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت انکو تھی چنانچہ انکی نظم فارسی میں جا بجا اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔

تصوف | علم تصوف سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "برای شعر گفتن خوب ست" انکو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے

انکے مطالعے سے ڈرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انکے ان متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔

تاریخ فن تاریخ اور سیاق[1] و مساحت وغیرہ سے انکو مطلق لگاؤ نہ تھا جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیمروز لکھ رہے ہیں کسی نے انکو موزخ سمجھکر کچھ سوالات کیئے ہیں۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنوں کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات از روے کتب اُردو میں لکھکر میرے پاس بھیجدیتے ہیں میں اسکو فارسی کرکے حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں، میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، موزخ نہیں ہوں۔

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

خط مرزا کا خط نستعلیق شفیعہ آمیز نہایت شیریں اور دلآویز تھا جیسا کہ اکثر اہل ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔

شعرخوانی شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے عذرے چند سال پہلے جبکہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے چونکہ انکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اسلیے صبح ہوگئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں، یہ کہکر اول اُردو طرح کی غزل اور اسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں

---

[1] لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ انھوں نے کہا ایسا ہی دخل تھا جیسا کہ مجھ شاعری میں ہے۔

پاتے، اور اسلئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنون شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب امام حسینؑ کی منقبت میں انھوں نے لکھا تھا پڑھا سُنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بنگئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خان مرحوم بھی موجود تھے۔ اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے کہا "آسمان ہم گریست"

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ بانی مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے۔ میں نے وہی پڑھ دیے پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب عجم اور ہندی سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھ سے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے؟ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے۔

مرد شفاعت وصلۂ صبر و خونبہا ہیچ از کسے نخواستہ الّا گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اسی شعر پر مصرعے لگانے تھے مگر کسی کو خود پسند نہ آئے اور یہ کہا کہ جس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے۔

مرزا کے اخلاق و عادات وخیالات

وسعت اخلاق | مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے

مل آتا تھا اسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور انکی خوشی سے خوش اور انکے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اسلیے انکے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بیشمار تھے۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے اُنکا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں انکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ انکی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر انکو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے، اُسنے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے اسکے جواب میں لکھتے ہیں "حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت؟ ہنجار نوازش نیازمندان بے نوا نہ انیست۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ سخنورم نہ سوداگر۔ مونیہ پوشم نہ کتاب فروش پزیرندہ عطایم نہ گیرندہ بہا۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذرست، ہرچہ شاہزادگان بہ آزادگاں بخشند ہبتک۔ ہیچ وشمر انیست، چون و چرا نیست۔ ہرچہ فرستادہ ام ارمغانست و ہرچہ خواہم فرستاد ارمغاں خواہد بود۔"

مروت مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بایں ہمہ۔ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکا

احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیتے لیتے دیکھتا تھا، اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔"

لطیفہ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کرونگا۔" باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

لطیفہ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھدیا تھا کہ آپ نے بہ سبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں "لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور کہی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قمر درویش بجان درویش لکھا تھا، جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

فراخ حوصلگی اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل انکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ انکے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے غدر کے بعد انکی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی، اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اسلیے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایکبار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں انکو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا لفٹنٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اسلیے انھوں نے دربار سے آتے ہی

خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیئے بھیجدی تھیں جب اسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب انکو انعام دیکر رخصت کیا

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گیے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد اُنکی حالت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی انکو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل انکے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوادیں۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بنکر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہنکر جائینگے؟ پھر اِدہر اُدھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ انکی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی نجیر از جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاوں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں،

بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں ذکا کی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح انکا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور انکو دیکھکر واپس بھیجدیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑجاتی تھی انکے دل پر نقش ہوجاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جسکی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے انکے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے تنبیہ بادمخالف لکھی تھی، انکو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھکر علیحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں انکو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سوتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم گلشن بیخار میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں "مضامین شعری را کما ہو حقہٗ می فہمد و جمیع نکات و لطائف پے می برد، و ایں فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است اگر طبع سخن شناس داری ہا یں نکتہ می رسی، چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال کسیکہ از ہر دو شربے یافتہ، درخطے ربودہ۔ بالجملہ

چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتہ مرئی شدہ"! نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دُور نہیں" حور نہیں اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر انسے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اس ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے کہ" عشق عصیانست اگر مستور نیست + کشتۂ جرم زباں مغفور نیست + ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین جس میں ہماری غزل ہے۔ اُردو غزل لکھتا تو اُسکا مطلع اس طرح ہوتا۔ عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں + کشتہ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کونسا مطلع اچھا ہے چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمہ سے بہت پست ہوگیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظری کے مطلع کو ناپسند کرینگے۔ اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلعے ہیں! ان میں آپ محاکمہ کیجئے کہ کونسا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور ہیٹھن کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سنکر سر دھننے لگے، اور متحیر ہوکر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ اُمید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

کتاب فہمی مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور انکو خوب سمجھتے تھے۔ نواب فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ۔ جو

حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ مطالعہ کر رہا تھا، اور ایک مقام پر بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ اُنھوں نے کسی قدر غور کے بعد اسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

حسن بیان اور ظرافت مرزا کی تقریر میں انکی تحریر اور انکی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور انکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا انکی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر مرشد ایک نہیں رکھا۔

لطیفہ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے۔ تو وہاں نواب صاحب انکے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے انکو دیکھکر یہ مصرع پڑھا کہ "آب چشمۂ حیواں درون تاریکیست" جب دیوان خانے میں پہنچے تو اُسکے دالان میں بسبب شرق رو یہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں خانہ تمام آفتاب ست"

لطیفہ ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی مرزا نے کہا میں تو تم کو میری

سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

لطیفہ مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا، اور اسکے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی۔ جسکا دراسقدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا، اُس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن۔ جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُسوقت مرزا صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے، اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ ہمنے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا۔ مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی انکے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہوجاتی

خودداری باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری و حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے۔ وہ بھی کبھی انکے مکان پہ نہیں جاتے تھے اور جو شخص انکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اسکے مکان پر ضرور جاتے تھے۔

ایک روز کسی سے ملکر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی

اسوقت وہاں موجود تھا، نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا مجھکو انکا ایک آنا دینا تھا اسلیے اوّل وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

لطیفہ ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار۔ مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ کہ آج مجھکو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہوکر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا اخیر میں انکی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لیئے گھر میں سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں اعلب یا شوربا ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی۔ اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب بس اس سے زیادہ انکی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

لطیفہ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے

تو بایزید کا"

آموں کی رغبت | نواب میں آم انکو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں انکے دوست دور دور سے انکے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے، اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کرکے آم منگواتے تھے۔

حسن طلب | انکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں انھوں نے امام باڑہ ہگلی بندر کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں "لختی شکم بندہ ام، و قدرے نالواں، ہم آرایش خواں جویم، وہم آسایش جاں خرد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندرست، اہل کلکتہ برآنند کہ قلمرو انبہ ہگلی بندرست آرے انبہ از ہگلی، و گل از گلشن، ایثار از جناب وسپاس از من، شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گذشت۔ و آزمی نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت"

لطیفہ | ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ، جن میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھکر عرض کیا "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے "بر سر ہر دانہ نوشتہ میاں * کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں" اسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی

لطیفہ | حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے انکو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔

ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا بیشک گدھا نہیں کھاتا۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دُور دُور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا صاحب نے کہا "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہییں میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤ نوش | مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس کمرے میں بوتلیں رہتی تھیں اسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اُس میں دو تین حصّے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اُسکی حدّت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست　　آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کافر نشے کی عادت نے

آخرکار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہونچایا جس کی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوے ہیں۔

لطیفہ | مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست۔ جنسے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو اُنکے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے، اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوے کراہ رہے تھے میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ اُنھوں نے نہ مانا، اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔

لطیفہ | ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور انکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا مرزا نے کہا آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر اُنکے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے، مگر خاص اُن کے لئے ہمیشہ ایک پیز تیار ہوتی تھی وہ اسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُنکے لیے مزعفر پکا تھا، وہی انکے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لیئے خالی رکابی طلب کی۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا، اور کہا حضور اور رکابی کیا کیجیگا

اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے" نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکادی "

لطیفہ ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھکر بولے" جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو۔ کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے، نہ بیلہے نہ بوٹا ہے، اگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دَم نہیں مار سکتا۔

لطیفہ ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لیکر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں اُنھوں نے کہا قبلہ وکعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؛ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا نہیں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اسلیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اُنھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اسکو بہت بُرا جانتے تھے، اور اپنے فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اسکے اُنھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

شراب کے متعلق انکی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے انکے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شرابخوار کی دعا قبول نہیں ہوتی مرزا نے کہا بھائی جسکو شراب میسر ہے اسکو اور کیا چاہئے جسکے لیے دعا مانگے۔

لطیفہ ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "بے مے نکند در کف من خامہ روانی + سر دست ہوا آتش بے دود کجائی + میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں

دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفس ناطقہ کو تو اجد بہم پہنچا، ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب ہائے غضب" یہ خط غدر کے بعد اُس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگدستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

لطیفہ | میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لیے کیا گیا تھا اسکا ذکر لکھا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شما را خواندند و بذوق شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب بود و نہ مرا نیز دل از جا رفتے"

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جسقدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہ ہونگے، یہاں ایک شعر اُردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
خجلت نگر کہ در حسنا تم نیافتند — جز رو زۂ درست بہ صہبا کشودۂ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز انگبہ بسیار!! — ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

اسلام کا یقین | مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے "من احب شیئاً اکثر ذکرہٗ"، توحید وجودی

اُنکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو اُنھوں نے جسقدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً **نظیری** اور **بیدل** کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

اُمید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را　　بدوستیِ سخنہائے آشنا بخشند

اُنھوں نے تمام عبادات اور فرائض وواجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیت کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اسکے عقائد پر استدلال نہیں ہوسکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اسکے قائل نہ تھے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے

گر دیدن زاہداں بہ جنت گستاخ　　دست درازی بثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی زروے تشبیہ　　ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے، لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو انکو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھکو کیوں اس قدر رنج وتاسف ہوتا ہے؟ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا

جاتا تھا، خواہ اس میں انکو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے، یا بدمذہب جانے۔

لطیفہ | غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی۔ پنڈت مولی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا؟

اگرچہ میرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

شوخی بیان | رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری؟

دہریت اور تصوف میں جو بوں بعید ہے وہ ظاہر ہے، دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراالنہری یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں، یہاں تک کہ شیعہ انکو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراالنہری،

سے تھی اسلئے کہتے ہیں کہ ایک ماوراالنہری رافضی یا شیعی کیونکر ہوسکتا ہے؟

جولوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیئے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب باعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں، کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا۔

ملے دو مرشد و نکو قدرت حق سے ہر دو طالب نظام الدین کو نسبت و سراج الدین کو غالب

لطیفہ | رمضان کا مہینا تھا، ایک سُنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا سُنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔

بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا | ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں میہمان تھے۔ انکا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اسکے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباسؑ کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا

چنانچہ اُنھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا، اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اسکے تدارک کے لیے کچھ رسالے شایع کرائے۔ اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جسکا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بَری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کردیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں

سلامتی طبع مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزی ذہن اور سلامتی طبع دونوں ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں، مرزا میں یہ

دونوں باتیں بوجہ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشق سخن میں جو ٹیڑھا راستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اسکے کہ کوئی استاد رہبری کرے۔ جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اسی قدر آہستہ آہستہ اس سے انحراف ہوتا گیا، اور آخر کار اساتذۂ مسلم الثبوت کی روش مستقیم پر آ رہے۔

مرزا ازراہِ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں اُفتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستایش میں مجھ سے اُنکا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو زور انکی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں اگر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم اسکو انکے نقص شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامتی ذہن و استقامتِ طبع کی دلیل جانتے ہیں جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا، اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اُٹھانا فی الحقیقۃ شاعر کا کمال نہیں ہے، بلکہ جس قدر اُسکی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے اسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری، کیونکہ ضرورت الانسان سے سب کچھ کراتی ہے مگر فی الحقیقۃ جیسا کہ ہم آگے بیان کرینگے۔ انکو بھٹئی کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں آتا تھا۔

مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین

اس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ جس سے مرزا کی سلامتی طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور انکو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، اُنھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمایش

کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں انکے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاصکر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی نبوت کے منافی ہے: اسلیے کہ خدا اسکے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے برخلاف اسکے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے۔ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

مرزا صاحب پر یہ فرمایش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کیجائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائل علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے مگر انھوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی۔ جو کہ ان کی کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے لکھکر مولانا کو سنائی۔ انھوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھارے برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے ان مطالب کو نہ ادا کرسکتا۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسئلہ نظیر خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ مرزا نے صاف صاف یہ تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مگر اس مضمون کو اس پیرایے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہوسکتا لیکن خدا قادر ہے کہ ایک ایسا ہی عالم پیدا کردے اس میں خاتم النبیین کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو خلق فرمائے۔ چنانچہ انھوں نے

اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر؟ — یا بیک عالم دو خاتم خوب تر؟
در یکے عالم دو خاتم تا مجوے — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھکر مولانا کے پاس لائے تو مضمونِ مذکور اس اخیر شعر پر ختم کرکے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان کرو۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ انکے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ بلکہ صرف دوست کی رضاجوئی مقصود تھی اُنھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اسکو تو اسی طرح رہنے دیا مگر اسکے آگے چند اشعار اور اضافہ کرکے کلام کو اس طرح مربوط کردیا

غالب ایں اندیشہ نپذیرفتم ہمے — خرد ہم برخویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندہ — دانم از روے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکم ناطق معنیِ اطلاق راست
منشاء ایجادِ ہر عالم یکے ست — گرد و صد عالم بود خاتم یکے ست

اسکے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جنمیں نظیرِ خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کردیا ہے۔

منفرد اندر کمال ذاتی است　　لاجرم مشلش محال ذاتی است

زین عقیدت بر نگردم والسلام　　نامہ را درمی نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی؛ اور اعوجاج سے کس قدر اُنکا ذہن اُبا کرتا تھا؛ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ انکی رائے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کردی تھی اور مرزا اسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہو جاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی جماعت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ اُنکے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اُسکے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے اُسکو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

دادِ سخن ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اسکے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا ہو خواہ بُرا۔ برابر تحسین وآفریں کیجاتی ہے اور اچھے بُرے شعر میں کچھ تمیز نہیں کیجاتی، مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی کوئی کیسا ہی معزز ومحترم آدمی ہو جب تک اُسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اُسکی تعریف نہ کرتے تھے، اخیر عمر میں تو اُنکا ثقل سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر وسخن سُن لیتے تھے، مگر جب تک کوئی شعر انکے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے، اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ انکی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اسکو وہ کبھی ہات سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر اُنکے دل میں چبھ جاتا تھا اُسکی تعریف

بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوق سخن انکو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔ ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے انکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑگئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا بھیا تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سنکر نہایت متعجب ہوئے، اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا، اس شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے۔

دکھلایئے لیجائے تجھے مصر کا بازار　　لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اسقدر متاثر ہوتے تھے

کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اُسکی بے انتہا تعریف کی، اور یہ کہا کہ اگر اب میں رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد۔

تقریظ لکھنے کا ڈھنگ

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمایشیں ہوتی تھیں اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقۃ بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں مرزا کی طبیعت چونکہ ملنسار جوا اور مرنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے۔ بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور اُسکے اخلاق، یا اُسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں۔ جو بے محل نہ ہوں۔ ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپنے ستایش میں مضائقہ کیا ہے۔

تقریظ دیوان تفتہ

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ۔ جو کلیات نثر غالب میں موجود ہے۔ لکھکر بھیجی تو اُنھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اسکے جواب میں لکھتے ہیں "کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بچالوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھو اُنمیں کے شعر بہت پاؤگے۔ اور مدح کے شعر کہ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُنکی مدح کتنی ہے؟ مرزا

رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوان حافظ کی جان جاکوب بہادر کی فرمایش سے لکھی ہے اسکو دیکھو، کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور انکی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی مطالب ہیں واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے ہمکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدلکر اسکے عوض ایک فقرہ اور لکھدیا ہے۔ اس سے زیادہ بھئی میری روش نہیں۔ ظاہر اتم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟

تقریظ تصحیح آئین اکبری

سر سید احمد خاں نے جب نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے آئین اکبری کی تصحیح کی، تو دلی کے مشاہیر نے اس پر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں؛ اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی جو انکے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سر سید کی خاطر بہت عزیز تھی، اور وہ اُن سے اور اُن کے خاندان سے مثل یگانوں[1] کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا، ابوالفضل کی طرز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو آئین اس کتاب میں لکھے ہیں انکو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود اُنھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نہ رکھتے تھے۔ اسلیے آئین اکبری

---

[1] مرزا آثار الصنادید کی تقریظ میں سر سید کی نسبت لکھتے ہیں "یا ہمگنانش دلبست از فرزانگی بایں مردمی دانا، و بانش بیمان مہر بست از دلنشینی بہ پیوند خون مانا"

کی تصحیح کو اُنھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو انکی یہ رائے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئین اکبری اور اُسکی تصحیح کی نسبت اُنکا خیال تھا اسکو تقریظ میں ظاہر کیے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس مثنوی کے اوّل کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مژدہ یاراں راکہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سیّد فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریفِ نوی
وین کہ در تصحیح آئیں رائے اوست — ننگ و عار ہمت والائے اوست
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد — خود مبارک[1] بندۂ آزاد کرد
گوہرش را آنکہ نتواند ستود — ہم بدیں کارش ہمی داند ستود
بر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود — آں ستاید کش ریا آئیں بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم — در وفا اندازہ دانِ خود منم
گر بدیں کارش نگویم آفریں — جائے آں دارد کہ جویم آفریں

اسکے بعد انگریزوں کے آئین و قانون و ایجادات کسی قدر بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویم پارینہ ہو گئے ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں:۔

طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش ست — لے فزوں از ہر چہ می جوئی خوش ست
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است — گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مبدأ فیاض را شکر انجیل — نوبرِ[2] می ریزد ز رطب ہا زاں نخیل
مردہ پروردن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

---

[1] مبارک بندہ آزاد کردن عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اسمیں لطف یہ ہے کہ ابوالفضل کے باپ کا نام مبارک تھا۔

[2] یہ اپنی نثاری اور انشا پردازی کی طرف اشارہ ہے۔

غالب آئین خموشی دلکش ست — گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش ست
در جہاں سید پرستی دین تست — از ثنا بگذر دعا آئین تست
ایں سراپا فرہ و فرہنگ را — سید احمد خانِ عارف جنگ را
ہر چہ خواہد از خدا موجود باد — پیشکارش طالع مسعود باد

چونکہ اس تقریظ میں آئین اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سرسید نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا اُسکی کچھ داد نہیں دی گئی تھی بلکہ اُسکو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا اسلئے اُنھوں نے آئین اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا۔

محققانہ نظر مرزا کی ذراکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلطنت کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ جامع برہان قاطع کی شہرت اور ناموری انکو اسکا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یزداں دل دانا وچشم بینا بہر آں دادہ است کہ کار دانش وبینش ازیں ہر دو گوہر پرفگیریم وہر چہ بنگریم بزبدستوری دانش آں نہ پذیریم استادی وشاگردی پیری ومریدی نیست کہ انتہا اعتقاد بس باشد وبدیں کلمہ مشہور کہ پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس ست از باز پرس ایمنی روے دہد" حالانکہ وہ ایران کے نامور شعرا کا نہایت ادب کرتے تھے اور اُنکا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے، پھر بھی اندھوں کی طرح انکی تقلید کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے اُن میں اُن کے کلام کو نچوں وچرا تسلیم کرتے

تھے اگر جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں ان میں انکی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ایک خط میں حزیں کا، جسکو وہ بہت بڑا اُستاد جانتے تھے یہ مطلع نقل کرتے ہیں "زمژگتازی آں نازنین سوار ہنوز ٭ زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز" پھر لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں ایک ہنوز، زائد اور بیہودہ ہے، متتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا، یہ غلط محض ہے۔ یہ سُقم ہے، یہ عیب ہے، اسکی کون پیروی کریگا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اسکو سند نہ جانو، اور اس کی پیروی نہ کرو۔ ایک خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا اُسوقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟"

حق پسندی مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرف انکے شعر میں کرتا تھا اُسکو فوراً تسلیم کرلیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی دردوداغ میں اُنکا ایک مصرعہ تھا "خوک شد و پنجہ زدن سازکرد" جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطق مکرانی کو بھیجی تو اُس نے مرزا کو لکھا "خوک سُم دارد نہ پنجہ، اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود" مرزا نے اسکے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ "اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا، اور اس مصرعے کو یوں بنا دیتا "خوک شد و بدنفسی سازکرد" چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو اُنھوں نے یہ مصرع اِسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہمچناں در تتق غیب نمولے دارند بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے نمولے کی جگہ نمودے لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے

نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنادو چنانچہ طبع ثانی میں اُنھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے عیدِ اضحےٰ بسر آغازِ زمستاں آمد" مرزا نے اوّل عیدِ قرباں لکھا تھا پھر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے کہنے سے عیدِ اضحےٰ بنا دیا گیا۔ حالانکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن خاں مرحوم کے بعد ہمیشہ اُنھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کرسکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی انکا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے

راست گفتاری

حالانکہ ایشیائی شاعری جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے مرزا کی رگ و پے میں سرایت کرگئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص انکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھکر واپس بھیجدونگا اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے اُنکے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپے کی! سو وہ بھی میں نہیں کہتا مجھکو دیڈالو، تم کو مبارک رہے مجھکو مستعار دو، میں اُسکو دیکھ لوں، جو میرے

پاس نہیں ہے اسکی نقل کرلوں، پھر تم کو واپس بھیجدوں، اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ واللہ باللہ میں اُس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کرکے بھیجدونگا؛ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھپر لعنت؛ اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو دو تو تم کو آفریں"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں۔

بدست مرگ دلے بدتر از زبان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیات مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج، معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے، ابکے تو مقرر بھیجیگا بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چاربید کی قسم، وساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم استاد کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کرچکا ہوں ؎

برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں کرتے تھے۔ پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا، مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

ناقدردانی کی شکایت

وہ اس خیال سے کہ اُنکے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگدل رہتے تھے چنانچہ اس بات کی اُنھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے

نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے، اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا، جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اسکے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ مہر نیمروز میں اس مضمون کو کہیں نے اپنا کمال شاعری محض ناقدردانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا" وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں "سینۂ من نفسی داشت بہ روان آسانی نیسے کہ از نشتر ان زار و زد زیاں زدہ من۔ کہ دم جزبہ نا بایست نہ زدم بنان مرا قلمی بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد! بیہدہ گوش۔ من کہ باران بشورہ زار فرو ریختم" یہی وجہ تھی کہ جب حسن اتفاق سے انکو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اسکو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

سخن فہموں کی قدر منشی حقیر کی تعریف

منشی بنی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جنکی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلّی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں انکی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا، اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا، اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی بنی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت

ہوئی ہے ؟ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے ؟ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں ؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے، آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی بنی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو۔ میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بیفکر ہوں، اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔

اپنے عجز کا اقرار

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمایش کیجاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہوسکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہداء کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُنکی بہت تعظیم کیا کرتے تھے اور اُنکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُنکے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، اور فرمایش ایسی چیز کی ہوئی تھی جسکو اور لوگ حد کمال تک پہنچا چکے تھے، اور قوئی میں انحطاط شروع ہوگیا تھا مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہمکو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے

ہاں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھکر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیجدیئے، اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں، ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں، مجھکو انکے درجے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے" اُنکا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آیندہ ہوگا۔

لطیفہ | بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جنکے سرانجام کرنے میں انکو دقت اُٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایکبار نواب علاء الدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اسکے تاریخی نام کی فرمائش کی اُسکے جواب میں لکھتے ہیں شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، اور طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خاں تیری جان کی قسم!! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں، نصیر الدین حیدر اور امجد علیشاہ ایک ایک قصیدے میں چلدیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ ناصاحب دہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہونگا نہ نام تاریخی ڈھونڈونگا۔

ہجو نہ لکھنا | باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری،

اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح وستائش کا صلہ انکو کچھ نہیں ملا، اور جو محنت وکاوش انکو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رائگاں گئی، مگر انھوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے، ہم کو انکے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے۔ جو میرے دوست اور مرزا کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں۔ اس قطعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے، اور اُسکا جواب مدت دراز تک مرزا کو نہیں ملا۔ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے۔ جسکو مشکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں اسلئے ہم اول اسکا خلاصہ اُردو زبان میں لکھتے ہیں، اسکے بعد قطعہ بجنسہ نقل کیا جائیگا۔

قطعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھدیا ہوگا۔ جسپر نواب کو آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا۔ اُسنے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے تخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں،

تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اسوجہ سے ہے تو اسکو نواب کی آرزدگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہئے۔ جب عقل نے مجھ کو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و نا اُمیدی اُمید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لیے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اسکے لیے آئینہ اور تاج سکندر سے انگشتری، اور تخت سلیمان سے جام جمشید، عالم غیب سے آب حیوان، چشمہ خضر سے، عمر ابد، نشاط جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں"

قطعہ

گفتم بہ خرد بخلوت اُنس — کاے شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا زچہ رو بود کہ نواب — ننوشت جواب نامہ۔ ہاں
آں گونہ عریضۂ کہ دانی — درویش نوشتہ سوی سلطاں
آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی — از صفحہ دمیدہ سنبلستاں
ایں ہر دو رسید نیست پیدا — زاں سو اثرے بہ ہیچ عنواں
رنجید مگر زمدح نواب — اے کاش نہ کشتمے ثنا خواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت "غالب! — زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بفکر ارمغاں ست — تا نامہ فرستدت بساماں
وانہا کہ بخاطرش گزشتہ است — زود آں ہمہ جمع کردنتواں
زود است کہ جمع نیز گردد — دیر ست کہ دادہ است فرماں
تا راہ روان بجسر و بر گرد — آرند بکوشش فراواں

دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس زمعدن و زر از کان
فیل از دکن و زمرد از کوہ — توسن زعراق و دُر ز عمّان
فیروزۂ نغز از نشاپور — یاقوت گزیدہ از بدخشان
جمّازۂ تیز رو زبغداد — شمشیر برندہ از صفاہان
پشمینۂ قیمتی زکشمیر — زریفت گراں بہا زایران
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست — بر رنج و ملال نیست برہان
چوں پیر خرد بدلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہای پنہاں
گشتم بہ دم امید واری — مرہم نہ زخم یاس وحرماں
گفتم کہ چو بامن ایں کرم کرد — آں قبلہ و قبلہ گاہ اعیاں
ناچار زراہ حق گزاری — تا کردہ شود تلافی آں
من نیز طلب کنم برایش — ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیماں
از عالم غیب جام جمشید! — از چشمۂ خضر آب حیواں
عمر ابد و نشاط جاوید — نیروے دل و ثباتِ ایماں
توفیق جواب نامۂ خویش — تو قیع عطا و بذل واحساں

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی - جو آلہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں - جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اُسی قدر اُنکی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں - یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے باایںہمہ بی بی شوہر کی خدمتگزاری اور خبرگیری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھیں - مرزا صاحب ہمیشہ

مردانے مکان میں رہتے تھے مگر انکے کھانے پینے اور دوا دارو اور جڑا اول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور انکے تمام رشتے داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھکر انکی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت انکی گھٹی میں پڑی تھی انکی زبان وقلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلیمی پر محمول کرسکتا ہے۔

لطیفہ کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنیکا حال مرزا کو لکھا اور اُس میں یہ بھی لکھا کہ اسکے ننھے ننھے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اسکے جواب میں لکھتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر اسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار انکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اور پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیفہ جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھکر کہا "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟"

لطیفہ ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے، اُسکا دیوان خانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر انکے

دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟ مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے۔

قطعہ

گیرکہ در روز حشر چوں تو بیفتی — برسر دوزخ نہند تیرہ نہبنن
لیک نباشد دراں مضیق مصیبت — در طلب ناں وجامہ کشمکش از زن بود
لیک نباشد دراں مقام صعوبت — شور تقاضائے ناروائے مہاجن

رباعی

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری — دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تندی خرامی دانم — در خانہ زنے ستیزہ خوے داری

لطیفہ مرزا اپنی شوخی طبع کے ہات سے مجبور تھے، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف جنکے تقدس اور بزرگی کے سبب اُنکے بڑے بھائی زانوے ادب تہ کرکے اُنکے سامنے بیٹھتے تھے، اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب اُنکے قبلہ وکعبہ تھے۔ اُنکے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے، اور جب بہت سے مُرید ہوجاتے تھے تو انکو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھواکر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اسکی نقل کردو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھدیا دوسرا حذف کردیا تیسرا پھر لکھدیا چوتھا پھر ساقط۔ غرضکہ اسی طرح بہت سے حذف واسقاط کرکے نقل اور اصل جاکر انکے حوالے کی۔ وہ دیکھکر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا؟ مرزا نے کہا حضرت

آپ اسکا کچھ خیال نہ فرمائیے، شجرہ دراصل خدا تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے، سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکالدی جاے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ وہ یہ سن کے بہت جزبز ہوئے، اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اُسکی نقل کرائی، اور مرزا ہمیشہ کے لئے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

موت کی آرزو مرزا یا تو اس وجہ سے کہ اُنکی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی، اور یا اسلئے کہ اُن پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مرجاؤنگا۔

لطیفہ ۱۲۷۵ھ میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مُرد" اس سے پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اس مادّے کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا حضرت! انشا اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مرزا نے کہا دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مرجاؤنگا"

لطیفہ ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستّر برس کے بڈھے اور ستّر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف برین وبا! اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکایتیں اُن سے منقول ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

اخیر عمر کی حالت مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہوگیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہوجاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا چوکی پر چڑھنا چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے، یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرض الموت کی حالت مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہوجاتا تھا، پھر بیہوش ہوجاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا اُس سے شاید ایک دن پہلے میں اُنکی عیادت کو گیا تھا، اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے نوابزادے حال پوچھا تھا؛ اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر۔ جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا۔

نکرد ہجر مدارا بمن سر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخ وفات آخر۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتّر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائینِ مزار دفن کئے گئے۔ اُنکی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اُردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف ایک تاریخ جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی (آہ غالب بمرد) جسکو مختلف لوگوں نے مختلف طور پر قطعات میں منظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک میر مہدی حسین مجروح اور مولف کتاب ہذا نے اُردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے جو اُسی زمانے میں چھپکر شائع ہوگئے تھے

جنازے کی نماز مرزا کے جنازے پر جبکہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفےٰ خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے! ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق انکی تجہیز و تکفین کریں، مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیئے گئے، اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُنکے اصلی اور مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا، مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ

اور سُنّی دونوں ملکر یا علٰحدہ علٰحدہ اُنکے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں اُنکا برتاؤ سُنّی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے اُنکی حق گزاری میں شریک ہوئے۔

شاگردوں کی کثرت مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ہندوستان میں بیشمار تھے۔ اُنکی وسعتِ اخلاق اور عام رضاجوئی نے یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لئے اُنکے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اسکے خط کا جواب اور اُسکی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

ماہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے سایہ ہمچو دود بالامی رود از بالِ ما

باایں ہمہ اہل دہلی و نواح دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیض صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے انکے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے، جیسے **نیّر رخشاں**، **عارف**، **سالک**، **مجروح**، **علائی**، **تفتہ** وغیرہم۔ اُنکے سوا خاص اہل دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت اُنکے شاگرد معنوی تھے، جیسے نواب **مصطفےٰ خاں** مرحوم۔ جنھوں نے **مومن خاں** مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اُردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید **غلام علی خاں**[1] مرحوم متخلص بہ **وحشت**

---

[1] یہ صاحب دلّی کے ممتاز لوگوں میں تھے انکے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے۔ قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق

جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور انکی صحبت سے مستفید رہے تھے۔
مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنے ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے:-

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

لطیفہ | یہ دونوں صاحب باہمدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے، یہاں تک کہ انکی دوستی عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی۔ ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیرآباد میں موجود تھا سید غلام علیخاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُنکا یہاں آنا سُن لیا تھا اُنھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا۔ اس میں خانصاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا۔

بیا ساقی بیا جانب بیشینی وچاے پیالی بیاد آر حریفاں بادہ پیمارا

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے تصرف سے اُس میں لطف پیدا ہوگیا ہے۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اُردوئے معلّی اور عود ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں، اسلئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۸) اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے اوّل سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر اودھ میں فوجدار ہوگئے پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ ان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہوگئے وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور غدر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتہ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفےٰ خاں مرحوم انکی ہر حال میں مدد کرتے رہے۔ ۱۲

لہ یعنی نواب صاحب تو شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے اسلئے انکی نسبت چائے پیالی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا۔ ۱۲

ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہ غالباً ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اُردو مکاتبات میں نہیں ہے جس سے انکی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ قطع نظر کمالِ شاعری و انشاپردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماء رجال، تحقیق لغات اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ اُنھوں نے فنون مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی، لیکن اکثر مصنفین اُنسے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اس میں اُن سے مشورہ کرتے تھے، خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اُسکی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جسکا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے۔ سہ

چونکہ نواب ممدوح اہل کمال کے عاشق تھے اور خاصکر مرزا صاحب سے اُنکی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں اسلئے مرزا کے ساتھ انکو خاص تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے؛ مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں اُنکا اُستاد ہونے پر فخر کیا ہے اسکے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

صد آفتاب تواں ساختن ببازیچہ　　زذرّہ کہ بود در ضیائے نیّر من

نہ ایں سپہر و نہ ایں مہر عالمے دگر است — من آسمانم و او مہر نور گستر من
من آں سپہر کہ دانم چنانکہ مہر بماہ — بہ مہر نور دہد نیّر منوّر من
من آں سپہر کہ ہر دم رسد عطیۂ فیض — بہ سعد اکبر گردوں ز سعد اصغر من
منم خزینۂ راز و در خزینۂ راز — ضیائے دین محمدؐ کہیں برا ور من
بدیں و دانش و دولت یگانۂ آفاق — بعصر کہتر و ازروے رتبہ مہتر من
بمہر دل بہ برادر ہمم — نہ یعقوبم — کہ پور خویش بود دلستان و دلبر من
سخن سرائے نوآئیں نوائے رانازم — بہ نالہ ہمنفس من بہ شور ہمسر من
بہ نکتہ شیوۂ شاگرد من بمن ماناست — صنم بصورت خود می تراشد از رمن
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم — بود بہ پایہ ارسطوے من سکندر من
زمین کوے مرا آسمان کند ہر صبح — طلوع نیّر رویش ز طرف منظر من
اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فشاں — شود بہ قاعدۂ ہمدم سمندر من
بہ بحر گر فتدم رہ بود سفینۂ من — بہ تخت گر بودم رائے گردافسر من
بمہر دوست دہم دل۔ نشاط خاطر من — بکین خصم نہم رخ لوائے لشکر من
گرم ز غصہ بتہ گشتہ کار مونس من — ورم ز کار فرو ماندہ دست۔ یاور من
زہے ز روے تو پیدا فروغ دانش و داد — بدیں فروغ جہانتاب گشتہ اختر من
ز تو کہ آئینۂ فیض صحبت اولی — ہوائے دیدن غالب فتادہ در سر من
مرا ستودی[1] و گفتی کہ من ازان توام — فدائے آن تو باد اقل و اکثر من
سعادت و شرف چوں منے بعرض کمال — زبس بود کہ بود چوں تو ئی ثنا گر من

نواب محمد مصطفےٰ خاں نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے

[1] معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف ان دونوں بیتوں میں اشارہ ہے ۱۲

بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ لیکن خان موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد انکے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل اُنکی غزل سے لگّا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق انکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ انکے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے انکے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُسکی نظر سے گر جاتا تھا اور انکی تحسین سے اُسکی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جنکی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:-

غالب بہ فنِ گفتگو نازد ببیں ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ انکے دیوان میں موجود ہے جس میں اوّل فخریہ تشبیب لکھی ہے۔ فخریہ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔

دستِ رد بر تاجِ قیصر مے زنم — پشتِ پا بر تختِ خاقاں می زنم

خردہ می گیرند بر من قدسیاں — گر نفس در مدحِ سلطاں می زنم

آں ہمائے تیز پرواز م کہ بال — در ہوائے مصطفےٰ خاں می زنم

عرفی و خاقانیش فرماں پذیر — سکّہ در شیراز و شروان می زنم

اوخرامد مست و من چاوش وار — بانگ بر اجرامِ ارکاں می زنم

گلشن کویش گزرگاہ من است — دوش در رفتن بہ رضواں می زنم

خوبی خویش بد آموزِ من ست — دم ز یاری می زنم ہاں می زنم

مہر ورزی بیں کہ با شم ہمنشیں — من کہ زانو پیشِ درباں می زنم

بشنود بے آنکہ باد آں را برد — نالہ گر در کنجِ زنداں می زنم

بنگرد بے آں کہ کلک آزاکشد — نقش گر بر صفحۂ جاں می زنم

دوسرا حصّہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

تمہید

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی - ایک ایسے زمانے میں، جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوق شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے - ایک نہایت مشکل کام ہے - مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے لیکن اوّل تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے، دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں پس جو شخص اس زمانے میں اُنکے کلام پر ریویو کرنا اور اسکے ذریعے سے مصنف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم اُمید ہوسکتی ہے - لیکن اگر کچھ اُمید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے، نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کر کے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جائے -

دفع غم نیست جز بہ غم خوردن　　چارۂ کار نیست جز کردن

استعداد سبق مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُنکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُنکی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا - اُنھوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے - گیارہ برس

کی عمر میں[1] شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کیئے تھے، جنکی ردیف میں "کہ چہ" بجائے "یعنی چہ" کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑگیا جسکے آخر میں لفظ کہ چہ "یعنی چہ" کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لیکر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اسکو دیکھکر حیران ہو گئے، اور مرزا سے کہا تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے، تم ضرور فکر شعر کیا کرو، اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروانہ کرو۔

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربّی و سرپرست انکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی نانہال جہاں اُنھوں نے پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور نانہال کی ثروت سے ظاہر امرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ جبکہ سر پر کوئی مربّی نہ ہو، دولت و آسودگی سے زیادہ چیز خانہ برانداز نہیں ہو سکتی۔

---

[1] منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعمر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثناء کلام میں انکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا "رشتہ در گردنم افگندہ دوست + میکشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست" لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔ ۱۲

مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری ہے اُسکی کیفیت کا خود انھیں کے الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں "بافر و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن با فرومایگان ہمنشین، و با اوباش ہمرنگ پائے بیراہہ پوے، و زبان بے صرفہ گوے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار" اسکے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد" الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی قدردان نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجے کا کمال بہم پہنچانا دور کنار، اُسکا خیال بھی دل میں گزرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف انکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بیخبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

دیوان ریختہ مرزا نے گل رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اوّل اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اسلئے ہم بھی پہلے انکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا۔ قطع نظر اُسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ

---

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جسکا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اسکا نام گل رعنا رکھا تھا۔

میر[1] تقی نے جو مرزا کے ہمدم تھے انکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد ملگیا اور اُس نے اسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا، ورنہ مہمل بکنے لگیگا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر مُلا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور اُنکی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا۔ چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا بیساکہ وہ خود فرماتے ہیں۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسداللہ خاں قیامت ہے

یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

کرے[2] فکر تعمیرِ خرابیہائے دل گردوں (۱)، نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیرِ افزوں (۲)　　بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آبِ اُمید رستن ہا

بحسرتگاہِ تازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں (۳)　　خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجیح پایا

---

[1] مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی، مرزا کے اشعار انکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے۔ ۱۲

[2] یہ شعر مرزا نے اپنے دیوان ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوان فارسی میں بہ تغیر الفاظ داخل کر دیا۔ یعنی اسطرح ؎

کند گر فکر تعمیرِ خرابیہائے ما گردوں　　نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا

رکھا غفلت نے دور اُفتادہ ذوقِ فنا ورنہ (۴) اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا
پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش (۵) خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا
موسمِ گل میں مے گلگوں حلالِ میکشاں (۶) عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہروانہ تھا
ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا (۷) گویا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں قطع نظر اسکے کہ طرزِ بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی، اسلیے انکے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارتِ فہم کے لئے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ و ایما کرنا اور ناخنِ بُریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا، کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے اُن نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو اُنھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہوسکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کفِ بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
شبِ خمارِ چشمِ ساقیِ رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورِ تنگۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بمعنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہونگے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا؟ ظاہر یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے انکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار انکی نظر میں کھٹکے ہوں، مگر چونکہ دیوان چھپکر شائع ہو چکا تھا۔ اسلئے اُنھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں انکے حق میں پوری ہوئیں ظاہر ہے کہ مرزا اول ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامتِ ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور اور نکتہ چین ہمعصروں کی خوردہ گیری اور طعن و تعریض سدِّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریفاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور

جنکو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا، اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈیسے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈیسے نکال

مرزا یہ سنکر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں، اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیواں میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اسلیے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے انکو بہت تنبّہ ہوتا تھا، آہستہ آہستہ انکی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اسکے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا انکو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے

اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ انھیں کی تحریکوں سے انھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُسکے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختے میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے اُنھیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو انکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ انکو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً انکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"

میں نے خود اسکے معنی مرزا سے پوچھے تھے، فرمایا کہ اسے کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائینگے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری۔ جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ۔ اور بلبل۔ جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں۔ انکے جگر سوختہ

یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف انکے چپکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ اُنھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سنکر کہا کہ "اگر اے کی جگہ جز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے" تو مطلب صاف ہوجاتا اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اسلئے وہ بہ نسبت اسکے کہ شعر عام فہم ہوجائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُنکی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترچھی چالیں انکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں، معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہولیں اور لیک کے اِدھر اُدھر آنکھ اُٹھاکر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرمو تجاوز نہ کریں، اور انکے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اسکے جن کی طبیعت میں اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر انکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ انکو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف

کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ خستہ شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی انکے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؟ اُنھوں نے میرا مانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ۔۔۔ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سنکر بہت جزبز ہوئے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلئے ناگوار گذرا ہوگا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دونوں محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا بھی انکی طبیعت کے خلاف تھا، کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں لباس میں طعام میں طریق ماندوبود میں یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتے تھے یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے

لطیفہ | مرنے سے آٹھ سات برس پہلے انھوں نے ایک مادہ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔ جسمیں ۱۲۷۵ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی، مگر مرزا بچ گئے اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں۔ میاں ۱۲۷۵ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اس سنہ میں مجھے مرنا چاہیے تھا) مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا، واقعی اس میں میری کسرشان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جائیگا" اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے۔ مگر انکی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ انکی اس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہرحال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہہ روی سے خبردار ہوے۔ اور استقامت طبع اور سلامتی ذہن نے انکو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا گو انکا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگرکاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہ ہوا، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اسلیے اُس میں ایک غیرمعمولی بلند پروازی پیدا ہوگئی تھی۔ جب قوت ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم وگمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی امنگ سے کبھی دوستوں کی فرمایش سے اور کبھی بادشاہ یا ولیعہد کے حکم کی تعمیل کے لئے

ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتدبہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نہال بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو، اور میں شرماتا ہوں، یہ غزلیں کاہیکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی انکا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لیجاتا ہوں"

قطع نظر اسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے چنانچہ ایک فارسی قطعے میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں:

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من ست
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید — ہر چہ در گفتار فخر نست آں ننگ من ست

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اسلیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کلام کے رتبے کا اندازہ اسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اسلیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں

اسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔ لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا یہی اسکے کلام کی خوبی اور حسن طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی وعام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکن رکین مانے جاتے ہیں پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اُردو کلام میں جیساکہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے مرزا کی موجودہ غزلیات۔ گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں، اور جسقدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہمکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا۔ جسکو اُمید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اُس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بتغیر اسالیبِ بیان عامۂ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا

کیے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں انکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں انکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔ برخلاف اسکے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ انکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے، اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جنسے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اور جس چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا، اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو انکو بھی آخر اُسی رُخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اسکے سوا ایک اور لیک اُسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور انکے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے، اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جنسے انکے

خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا (اخلاق) آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے۔ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

فطرت انسانی

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (ترجیح) ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے ہستی کو نیستی پر ترجیح دی ہے، اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعے سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا بُرائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا، مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے (اخلاق) آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے - اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے - دعویٰ یہ ہے کہ جسقدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے - اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک - جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے - اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا - موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا -

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ لعاشقاں جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت - یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو؛ مگر ہم نے آجتک نہیں دیکھا - اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا - مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو اسلئے کہ اُس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اُسکو دوستی سمجھتے - لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ ہم پہنچائے ہیں جنکا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے ؎ اسکا ۱۱/۱۱/۱۱

فضیلت انواع انسانی ۶

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں اُس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اسکے متحمل نہ ہوے اور ڈر گئے اور انسان نے اُسکو اُٹھا لیا، شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اس کے

موافق اُسکو شراب دیجاتی ہے، پس کوہ طور۔ جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی آلہی کا متحمل ہوسکتا ہے یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اُس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز (شوخی) دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اُردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہوگیا ہے۔ مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ آلہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد (شوخی) مجھ سے مرے گنہ کا حساب ایخدا نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور درپردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں۔ وہ شمار میں اسقدر زیادہ ہیں کہ جب انکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نہ کرسکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا، اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

شکایت اہل وطن

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اس پر خدا کا اسلیے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا! لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو، مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود (تصوف) ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اُسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے ورا الورا ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اُسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو (عاشقانہ) یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

سہل ہے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے، اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے سے کرنا۔ درحقیقت حُسن مبالغہ معراج ہے

جسکی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے (عاشقانہ) دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہوجانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ وقت نہ تھی، کیونکہ ہم مایوس ہوکر بیٹھ رہتے۔ اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں، اور اسلئے شوق آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے (وفاداری) مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسکو کعبے میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کردیا، اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ (تصوف) دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملیگی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

حسن بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا (اخلاق) جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے
جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اسکی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی
اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے (تصوف) بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تخیل نے اسکو بالکل انوکھا اچھوتا
مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ
ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اسکی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا
ویران ہوجاتی، پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ
ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس
بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد ہونا
دلالت کرتا ہے کہ اسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید (نا امیدی) نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے
نا اُمیدی کی غایت اِس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان
کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت
کے ہم نہیں کرسکے اور انکی حسرت دل میں رہ گئی انکی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جدت مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا
صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی
جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول
ہیں، مرزا جہاں تک ہوسکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ

تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت انکو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انکی ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے، استخواں کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں اُن کے ابتدائی ریختے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جسقدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام (مثال ۱) مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

یہاں سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزاے عالم میں سے ہے اور تمام اجزاے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں۔ چراغ رہگذار بادسے تشبیہ دی ہے اجو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

دوسری جگہ سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ حسن معشوق کے مقابلے میں اُسکو ناقص الخلقت قرار دیا ہے۔ ماہ نخشب کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے (مثال ۲) خورشید ہنوز اسکے برابر نہ ہوا تھا

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج (مثال ۳) شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی نادر و بدیع تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اُردو اور فارسی

بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے بہت بچتے تھے مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں مبتذل ترکیبیں، جسقدر اُنکے کلام میں کم ملیں گی ظاہر اکسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں۔ مثلاً صل علیٰ کا لفظ جو بجاے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے۔ اُسکو کبھی جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے۔

اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے۔ تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام [redacted] سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ فوت ہو جاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اور جسکی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلا شبہہ استعمال کیا ہے لیکن استعارے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا (مثال) بات کرنے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا یہاں اس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اس طرح ادا کیا ہے "بجلی کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

لہ مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز (مثال) پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گیے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے۔ ان مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ (مثال) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے (مثال) اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں (مثال) جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کُشا تھا
دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُس وقت اُنکے دفع کرنیکی طاقت تھی

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

تیسری خصوصیت تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں، کیا نثر میں کیا نظم میں؟ باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے، جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں، ایک سودا دوسرے انشا، مگر دونوں

کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی۔ بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے۔ انکے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے وہ لوگ۔ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اُٹھا سکتے یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے (مثال) دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اسقدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اسقدر ویران ہے کہ اسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئی مرد افگنِ عشق (مثال) ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مرد افگنِ عشق کا ساقی۔ یعنی معشوق۔ بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اسلیے اُسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔

اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں، اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق یعنی کوئی نہیں ہوتا اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے، اور مایوسی سے پچھے پچھے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کر دیگے تو فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کیونکہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز (شلاح) کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اسلیئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند (شلاح) گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اسکو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں" اور پھر آدم سے اُنکو زک دلوائی، اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم (مثال) قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور
دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے اسلیے وہ ایک قدِ آدم کم
ہوگیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا (مثال) ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو
اس شعر میں ترے سر کی قسم ہے ہمکو" اس جملہ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ترے
سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑا لینگے۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو ترے سر کی قسم ہے۔
یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں
کھانے کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ (مثال) جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
اسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر
کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند
ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم
کیا قیامت برپا کرو۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا (مثال) بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس
ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دینگے، اور دوسرے شوخ معنی
یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے (مثال) دیکھوں اب مرگئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے
کون اُٹھاتا ہے مجھے" اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے
اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور

دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر (مثال) بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں، بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں، پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اُسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا، اور بادپیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے۔ اور جس طرح بادپیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلیگا کہ آجکل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

مذکورۂ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے جو مرزا اور انکے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کیے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔ قدمائے اہل ایران جنکا دور مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُنکی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے، اور گو اسالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہوگئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے

بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لیے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بنا لیتے تو اُنکے لیے میدان غیر متناہی موجود تھا مگر اُنھوں نے محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا، اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اُنھوں نے تو اسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی، مگر جن کی فطرت میں اُرجنیلی اور اُپج کا مادّہ تھا وہ اُنھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری ظہوری، عرفی، طالب، اسیر، اور اُنکے اقران و امثال کی غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں:-

گناہ اگرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ — تو در طریق ادب باش و گو گناہِ من است

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اُس میں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش — می آرم اعترافِ گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نبود دور گر شہ بر سد حال — پادشاہے کہ بہ ہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اُسکا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی۔ ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مروّت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم — نمی باشد چراغے۔ خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بیمقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا۔ اسلیے مروت اور کرم نے تجھ پر لازم کر دیا ہے راتوں کو کوٹھے پر چڑھکر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی

روشنی سے اُنکے گھر میں چاندنا ہو جائے مطلب یہ کہ انکے حال سے واقف ہو کر اُنکی مدد کرے۔ سا ۱۱-۱۲

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اُس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں، لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا ہے، کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا اسلیئے نئی نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی، کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدوّن ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اُسکے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اُسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آجاتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور اُنھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ، وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کر کے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے۔

میری تغییر رنگ پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغیرِ رنگ کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے۔

میری تغییرِ رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رُخِ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے

رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں، غالب مومن، اور انکے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اسلیے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں　　رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے　　نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں　　بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اُسکی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجوریاں　　مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اُسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں　　کھینچتا ہے جسقدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے　　یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور

معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہت گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا چھٹے میں دل رنجور کا نقشِ مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمتِ عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود مُوت کے موت نہ آنی۔ یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں، اور اگر تھیں تو صرف اسقدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی، وطالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روبروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرائمگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر، وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیئے۔ قدما اردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیبِ بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے

ہیں کہ بجائی اشاعری، معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے۔"

اگرچہ مرزا کی اُردو شاعری پر بحث کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اسلیے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جسقدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دیے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں ان کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائیں گے اور کہیں کہیں محاسن شاعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا۔

ستائشگر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا (ارتداد) وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

طاق نسیاں وہ طاق جسمیں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاق نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جسکو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاق نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا (تصوف) یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے، ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب (عاشقانہ) خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ خونکان یار کی امانت تھی، اور اسلیے اُسکے ایک ایک قطرے کا حساب اُسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح (عاشقانہ) کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا (تصوف) جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ (ظرافت) تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سُنا ہے کہ جسوقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سُنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے، مرزا نے کہا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اسلیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"

نہ مارا جان کر بیجرم۔ قاتل تیری گردن پر (عاشقانہ) رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھکر اسلیے قتل نہیں کیا کہ خون بیگناہ اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بیگناہ کے حق آشنائی کا رہیگا

سب کے دلمیں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا (عاشقانہ) مجھپہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ (شوخی) بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اُس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندۂ گل کو خندۂ بیجا اسلیے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھکر یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔ پس گویا اُسکا خندہ بے محل ہے۔

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں (تو ہ) گر مَیں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اُس نے زبردستی کیوں نہ پلادی؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا (عاشقانہ) بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگی دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے (حقیقت دل) کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق (شوخی) آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم (عاشقانہ) میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنگ آبی سے ہوا خشک (توصلۂ گناہ) میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اسقدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہوگیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا، تذکرۂ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی - یہ بعینہٖ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سنکر اُسکی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ "اس میں مرزا کا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے" غرضکہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اُس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اُسکی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اُس سے بھی زیادہ نکلے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے (عاشقانہ) صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں (عاشقانہ) شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف (عاشقانہ) عقل کہتی ہے کہ وہ بیمہر کس کا آشنا

ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیان اپنا (رقابت) بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حُسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرمِ راز اور ہمنشیں تھا وہی سُنکر میرا رقیب بن گیا، کیونکہ اوّل تو ایسی پریوش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے - پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیان اپنا" سارے شعر کی جان ہے جسکی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہوسکتی

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے (ظرافت) بارے آشنا نکلا انکا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لیئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جسقدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے، اور یہ ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے! ہمارا اُسکا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے (شوخی) بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی و ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم (عاشقانہ) تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالے کی اجازت نہ ہوگی تو ہم اُسکو ضبط کرینگے اور اُسکا اثر تجھ تک پہنچیگا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں (اصرار) ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ (شوخی) مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی اب دیکھیے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جسکا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے (توحید) شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل (توحید) جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا (تصوف) درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائیگا تو مرجائینگے یعنی فنا ہو جائینگے۔ گویا قطرہ دریا

میں کھپ جائیگا۔ اور یہی اُسکا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا ہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد (عاشقانہ) تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا (عاشقانہ) باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال (عاشقانہ) ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا (عاشقانہ) روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل مثالی تشبیہ ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب (عاشقانہ) یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن (شوخی) جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات (شوخی) سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ (عاشقانہ) ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ (قدرِ سخن یعنی) لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں (رضا) جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا (عاشقانہ) یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات (شکوہ ابنائے زمانہ) دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں (تصوف) ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُسوقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت

توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالے۔ مثال کسقدر ممثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اُسوقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور دردانگیز ہوتا ہے۔

فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے (غلط فہمی) متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل واقعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اسباب کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کریگا۔

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اُس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھ چارہ جوئی کا ہے طعن (عاشقانہ) غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شکوہ اہل وطن

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اُسکی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے، کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بیقدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جسوقت (عاشقانہ) میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

زہر ملتا ہے نہیں مجھکو ستمگر، ورنہ (عاشقانہ) کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اُسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اسلیے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہاں (زاہدانہ) رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا (معاملہ) پرسش ہے اور پاسِ سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی (شوخی) آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی (فخریہ) روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزبان کے لفظ میں ابہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں (عاشقانہ) ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چکر پھرنے کی دھت۔ کہتے ہیں، اُسکے پاؤں میں چکر ہے۔ یعنی اُسکو پھرنے کی دھت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اُسے زنجیر نہ سمجھو

بلکہ چکر سمجھو۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی بیٹا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اسلیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

الفتِ گل سے غلط ہے دعوی وارستگی (عاشقانہ) سرو ہے باوصف آزادی گرفتارِ چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود (تصوف) قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے (عاشقانہ) ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ (عاشقانہ) ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوءظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب نہ دینی کہ کل نہ ملیگی ساقی کوثر کی فیاضی پر سوءظن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر (عاشقانہ) آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اسلیئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "مگر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے، یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جاے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف، اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل و ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے، مگر اسکا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے۔ وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب

وہ دلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے مگر اُسکا غمزے میں بگڑنا اسکے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہر اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں، اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جسکو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اسلیے مرزا کا کلام سنکر اکثر اُلجھتے تھے اور انکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بیساختہ اُنکے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی فرمایا "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"۔ مگر فی الحقیقۃ یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا جہاں تک ہمکو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا

انسان کی مجبوری

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہو جانا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بیقابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حُسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر (تصوف) یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدت وجود اور اکثر موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز

ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرتا کہ "یہاں کیا دھرا ہے" منتہائے بلاغت ہے۔

(منقبت) غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغول حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(عاشقانہ) پھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

(سلوک) چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُسکو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اسکا تعاقب کرتا ہے "وَلَمْ جَرّا" اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

(تصوف) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

شکوہ اہلِ وطن — کرے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

(عاشقانہ) دونوں جہان دیکھ کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراغ حوصلگی اور اُسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے، یعنی میں جو دونوں جہاں لیکر خاموش ہو رہا اسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہوگیا بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اسلیے خاموشی اختیار کی۔

(تصوف) تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(شوخی) میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سُنکے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف۔ وہ ظریف جسکی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھکر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے

اُس نے یہ سنکر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا، یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔
ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر (عاشقانہ) معشق کا اُسکو گماں ہم بیزبانوں پر نہیں
قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا (عاشقانہ) تعجب سے وہ بولا لیوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
سادہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے (عاشقانہ) کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اُسکی
کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا
ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!!
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں (شوخی) کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
جہاں میں ہوں غم و شادی سبھی ہیں کیا کام (شکایت) دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے (شکایت) لوح جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے (شکایت) آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں (تناسخ) خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر (لفظار) لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوار زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزنِ زندان
ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف
کی طرف نگراں رہتی ہیں۔
نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں (عاشقانہ) جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں بارِ پلکِ پار (عاشقانہ) جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں
نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں
بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔
واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب (شوخی) یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے، کیونکہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُنکی گالیوں کا کیا جواب دوگے جب کہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم (تصوف) ملتیں جب مٹگئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جنکا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے، اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹجاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنجاتی ہیں۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا (تصوف) دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز (تصوف) آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں (تاثیر بیِ غم) موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو (اخلاق) کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقتِ واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بیخبر ہوتا ہے، تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن جسقدر اسکا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اُسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جسپر حسد و رشک کیا جاوے۔ بلکہ اسکی

محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے، اور اسلئے انصاف و فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اور دل کی ریس و پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو" جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے

کہے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں (فغانی) بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم صواب سے (نگوتی) ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو
آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں (استغفاللہ) ایرا ہی دیکے ہمنے بچایا ہے کشت کو
خدا شرما ے ہاتھوں کو کر رکھتے ہیں کشاکش میں (عاشقانہ) کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا (شکر بیرسلاں) رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید (رزدانہ) مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ۔ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں بجائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجاے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کیگئی ہے، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضاے بلاغت ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست (اصوف) لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا (اشکابت) وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتا ہے۔
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ (رانقوض) کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو (رندانہ) اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چند تکلف سے (عاشقانہ) تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں (عاشقانہ) خدا وہ دن کرے جو اس سے میں بھی کہوں وہ بھی
غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے، اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔
ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا (شوخی) ظاہر ا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جسپر سے حرف بآسانی کرلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اسکا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں جسپر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔
ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ (تصوف) جسکے جلوے سے زمین تا آسماں سرشار ہے
ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔

انکی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

پینس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچہ سے میرے (عاشقانہ) کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے (عاشقانہ) کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف (شکایت) آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے (عاشقانہ) بے نیازی تری عادت ہی سہی
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب (شوخی) ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت — می تواں گفت کہ ایں بندہ خدا وند نداشت

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے (معاملہ) بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو (معاملہ) دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے (معاملہ) گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جاے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے، اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے، پھر اسکے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے، اور شرما جانے کا متعلق اور۔ گر حیا بھی اُسکو آتی ہے "یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے۔ اور شرما جاے ہے "یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہوکے عاشق وہ پری رخ اور نازک بنگیا (عاشقانہ) رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اڑتا جاے ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ (عاشقانہ) ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں ملجائیگی (نا امیدی) یہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل میں ہے
فرداودی کا تفرقہ ایک بار مٹ گیا (عاشقانہ) تم کیا گئے کہ ہمپہ قیامت گزر گئی
کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و نود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی
کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی، اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا
جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بزمانۂ حال ہو جائیں گے پس
تم کیا گئے گویا ہمپر قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں، نہایت سختی کا زمانہ
گزرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد قتل (رشک) میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
لازم نہیں ہے خضر کی ہم پیروی کریں (شوخی) جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے
دیکھے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر (عاشقانہ) کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام (شکایت) ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی (شکایت) کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی (حسرت) اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں (ضبط راز) ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد (شوخی) پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی (بیخودی) کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار (عاشقانہ) یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز
و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُن سے ناواقف ہے، اسلیے باوجود اپنے مشتاق
ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں (عاشقانہ) کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین (شوخی) ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ محض از راہ
شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال وجواب سے بچنے کی تدبیر اسکے سوا نہیں
کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین اُسکی بو کی کراہت سے بغیر سوال وجواب کیے
چلے جائیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے (افسوس) ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

نتیجۂ بے اعتدالی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے (افسوس) اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
چھوڑی اسد نہ ہمنے گدائی میں دل لگی (شوخی) سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو وصنوبر (عاشقانہ) تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے
دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر (عاشقانہ) کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آئے
حُسن مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے (عاشقانہ) اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے معشوق کو مہ خورشید جمال اسلیے
کہا ہے تاکہ اسکو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ (شوخی) جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے (اخلاص) وہ گدا جس کو نہ ہو خوے سوال اچھا ہے
اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق (عاشقانہ) وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدی کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم چہ بگویم کہ غم از دل برود چو تو بیائی

دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھکر سمجھ جائے کہ اُسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا بایں ہمہ سعدی کے شعر کو بہر حال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیونکہ الفضل للمتقدم

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض (عاشقانہ) اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اُسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن (شوخی) دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پُرزوں میں شکوہ سے یوں اگ رہے جیسے بابا (عاشقانہ) اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم (عاشقانہ) آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف (عاشقانہ) آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل (عاشقانہ) جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جسکے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز (شوخی) سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا (ارزالی) دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو (عاشقانہ) ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا (عاشقانہ) ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غزل بہاریہ و شکر صحت بادشاہ

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری (عاشقانہ) اور پھر وہ بھی زبانی میری
قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں (شکایت) سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اُس پر پاؤں رکھکر گزرے یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اُس پتھر کی طرح بیقدر ہوں پس میری گرانی کسقدر ارزانی ہے۔

ذہن اُسکا جو نہ معلوم ہوا (عاشقانہ) کھل گئی ہیچمدانی میری
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو (عاشقانہ) لکھ بیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور (عاشقانہ) دل میں نظر آتی تو ہے ایک بوند لہو کی

لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے اور دونے روئے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اسلیے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اُسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے (عاشقانہ) یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
بیحوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا

چاک مت کر جیب بے ایام گل (مذاقِ مجنوں کی ہدایت) کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے عموماً تشبیہ دیجاتی ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے، پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر اس میں لطف یہ ہے کہ مجنون کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنون زیادہ ہوتا ہے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے (رندانہ) پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی (قصوں) ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد (رندانہ) مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اُسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

مے وال بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا (انتظار) لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنیکا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے (انتظار) تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جائے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے (عاشقانہ) عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے (شوخی) جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کیے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہوسکتی ہے نیکی نہیں کرسکتا۔ (عاشقانہ)

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پانوں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی (عاشقانہ) نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوی جنسے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب نہ عشق ترک ہوسکتا ہے نہ اُس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے (تصوف) ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک (تصوف) اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے (عاشقانہ) نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیجے
سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ (اخلاق) خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کیجے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے (عاشقانہ) دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا۔ بیشرم و بیباک ہونا پاک۔ آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہوسکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بیشرم و بیحجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ (تصوف) کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے۔

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو دور نالہ و آہ دُور تو و نزدیک ترا حالِ تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اُسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اُس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی (تصوف) مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں مجادثت اور مسامرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو) کے دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی بلکہ اسکے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر (عاشقانہ) فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے (تعریض) وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے (اشکال سنا) اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ (لاابالی) کیوں کسی کا گلا کرے کوئی
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (زار نالی) بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اسکے پورے ہونے کے لیے جلدی کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے۔ یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضاے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہییں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن (تکلیف) بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہیئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

بھرم کھلجاے ظالم تیرے قامت کی درازی کا (شوخی) اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا (عاشقانہ) اسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

سرکہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ (شوخی) پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے (انتظار) وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اے پرتو خورشید جہانتاب ادھر بھی (تصوف) سایے کی طرح ہمپہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متوہم بوجود ہے اور فی الواقع اسکی کچھ ہستی نہیں ہے اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہو جاویں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کا فور ہوا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو (شوخی) کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب (شوخی) آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر (عاشقانہ) کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں (شوخی) حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی
اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں
لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ
کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اسکے لیے منت
یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفر حج کا وہ اشتیاق
اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے (زندانہ) یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو (قناعت و عبرت) ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے
یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیے کافی ہے مگر اس
خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے اُس پر یہ بات
ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں (قناعت) گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن
اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے
ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے (عاشقانہ) رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کیلیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر (شوخی) نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر (کوشش) کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی (شوخی) اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزدہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ اُس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ قاتل پاسبان سے چاہتا کیا تھا، سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایے میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے اسکے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زمانہ عہد میں ہے اُسکے محو آرایش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گزرانا تھا کہ

انکی تنخواہ جو شش ماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھکو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گرا پنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ[1] سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مجھکو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے ابکی سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربّنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُسکے ملنے کا ہے عجب ہنجار

---

[1] بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔ ۱۲

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر لکھیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سرکار[1]
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں (شوخی) — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام — ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ دستور تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اسلیے مرزا نے اسکو اس پیرایے میں بیان کیا ہے۔

---

[1] شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت۔ حضور والا نے (شکر) مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اسکے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ جسوقت چوبدار۔ بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالبعلم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُس نے مرزا سے متعجب ہوکر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اُس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھپر بڑے ظلم ہوتے ہیں مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بناکر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھپر ظلم ہوتا ہے اور کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں۔

قطعہ ۴

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو (شوخی) اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھولکے کھانے کو کچھ نہیں روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا، جس کو سنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

سہل تھا مسہل و لے سخت مشکل آپڑی (عذریہ) مجھ پہ کیا گزریگی اتنے روز حاضر نہ ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے

قطعہ ۶

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے (شوخی) جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک[1] ہو میرا شریک غالب ہے

رباعیات

رباعی ۱

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل (شوخی) سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل وگر نگویم مشکل

اس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر انکی فرمایش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنوران کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے۔

---

[1] شریک غالب اُس شریک کو کہتے ہیں جسکا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریک غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے۔ ۱۲

رباعی

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جمجاہ نے دال (شکریہ) ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دیں و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اسکے شکریے میں لکھی گئی ہے۔

رباعی ۳

(مبارک باد سالگرہ)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے (شوخی) کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں۔ کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ! وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں مرزا نے غایت درجے کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کر وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت و لعل و ہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

سامان خورد و خواب کہاں سے لاؤں (شوخی) آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن خمخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں (عاشقانہ) عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا کیونکر مالوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے۔ ظلم سے ہاتھ اُٹھانا اُس سے دست بردار ہونا اور اسکو ترک کرنا۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے (شکریہ) بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے اسکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے۔

نثر اُردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے، مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہنیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت بضرورت انکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل

اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب انکی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت انکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی۔ اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں۔ شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اسلیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں؟

غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جسقدر اُنکی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے، اور انکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ داں اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے داد سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ تیمور یہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے،

انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو۔
اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ
بعض اوقشل تحریروں میں دیکھا گیا ہے کہ اُردوے معلیٰ اور بوستان خیال
کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے، لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے
قدردان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور
دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں جو برہان قاطع کے طرفداروں کے
جواب میں لکھے ہیں، لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامہ غالب اسکے سوا چند
اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا
شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز انکے
خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اُردوے معلیٰ میں اور اس سے کم عود ہندی
میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں
کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو اب تک شایع نہیں ہوئے
مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا
سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ انکے بعد کسی سے
اسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ
طریقہ اور بہت سی باتیں جنکو مسٹر سلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے
رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اڑا دیں، وہ خط کو
کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور

سلہ یادگار کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد انوار المطابع لکھنؤ میں کل رقعات اور تقریظیں چھپ گئی ہیں۔ ۱۲

مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں اسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً انکو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اس نے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے" اس مطلب کو انھوں نے اس طرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے ملا

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اسکو اس طرح شروع کرتے ہیں "اے میرن صاحب السلام علیکم حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں! مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب! اسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب

پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ہیں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ" اسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعضی جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں" میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سنو۔ دلّی کی تمام مال و متاع وزر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسکو بخل کیا، اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جسقدر اُنکو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا، اسی قدر انکو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصّے لکھے جاتے ہیں ان میں اکثر اس قسم کے سوال وجواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر

وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھدیجاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؛ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؛ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا شاید قصّے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کردی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اسکی پیروی نہ کرسکیں مگر وہ چیز جس نے انکے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر انکی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹکل، سوشل اور لیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں، باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اس میں اُنکی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟ یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں انکے بچپن کے زمانے میں انکے رقعے کا جواب۔ جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب کی پُتلی۔ چشم جہاں بین تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر۔ اور پُتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تو صرف تمھارا دلدادہ ہوں۔

لطیفہ ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں انکو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

شوخی ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو

روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

لطیفہ: جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مولف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں، ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے۔"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاء الدین خاں کو لکھا ہے لکھتے ہیں "استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اُنکی چچی تھیں اور مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اس نظر سے کہ سید ہیں صدو۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے "سوی اللہ واللہ مافی الوجود" سجود۔

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں دیوانخانے کا حال محاصرے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

نواب علاء الدین خان اور اُنکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلّی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاء الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں "سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب

سلہ یہ اشارہ صاحب برہان قاطع کی طرف ہے۔ ۱۲

نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں میں نے کہا اتنا ہی؟ جتنا تم اسکو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے غرضکہ میں نے بظاہر انکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے۔

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آکر بعضے ضروری خرچ بند کر دیے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں صاحب کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو۔ الخ اسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں" بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی، ہر ایک پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات روئے کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، یا اینمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رامپور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اسکو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گذارا مشکل ہوگیا روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک

چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی اُنکو یہ عبارت پڑھا دینا۔ اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا "

اے نیخجر زلذت شرب مدام ما" دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمتہ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام بریں زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا

بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی وامامت مرتضوی اُس میں جلیں ۔ + + سُنو مولوی صاحب! تم نے کئی ہاتھوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا جُوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو" الخ اور پھر پڑھتے ہو اسکے سامنے کر اسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے مجموعہ نثر جداگانہ یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں سنو! عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب وگل ۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنگا ہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں، چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۳ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا ۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا ۔ ایک بیڑی میرے پانوں میں ڈالدی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا، فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھیرایا ۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا ۔ پایاں کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے، اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا ۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔ پانوں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی ۔ طاقت یکقلم زائل ہوگئی ۔ بچیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا، میرٹھ مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا، کچھ دن کم چھ مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا ۔ بھاگوں کیا ۔ بھاگنے کی طاقت بھی لوٹ نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھیے

لہ بیڑی سے مراد الٰہیہ اور دو ہتھکڑیوں سے مراد حسین علیخاں اور باقر علیخاں جنکو مرزا نے انکے والد زین العابدین خان کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا ۲

کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں
بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد
نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم سوی شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو انکی محبوبہ جینا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اس
میں لکھتے ہیں آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے
جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور
تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور
فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سرد فتر اور
پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسنؒ بصری
سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اسکے سامنے
مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلیٰ
اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب
ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر
میں ایک +++ کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم
تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس
بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے یا آنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا، اس فن سے میں بیگانہ محض
ہو گیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ
بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی صبر کرو اور

ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی اگر عاشقی کنی وجوانی + عشق محمد بس است وآل محمد
العقد بس ماسوائے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنّا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب! ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ وبو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق وفجور نہیں پیو، کھاؤ مرے اُڑاؤ مگر یہ یاد رہے مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بدور وہی ایک حور۔ بھالی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زن نو کن اے دوست در ہر بہار کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "حلیہ مبارک نظر افروز ہوا + + + تمہارا حلیہ دیکھکر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا

رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری؟ بقول شیخ علی حزیں

تا دستر سم نبود زدم چاک گریباں شرمندگی از فرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی موچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملّا حافظ۔ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّا، بھٹیارہ، منہ پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جسدن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہوگیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اُسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مرگئی آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اسکے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے۔"

لہ یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب تک مجھے موقع ملا برابر داڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا۔ پس اس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، میں لم یلد ولم یولد ہوں

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط لکھتے ہیں یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں؛ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا لمحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرامگاہ عرش نشین خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زادویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ اے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلا لضا حب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بیجرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو، بولے کیا بیجا بے عزت ہا کو بھی سے شراب کندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام، قرض لیے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں" صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے، شعر کہے دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست تھے اور منشی

بنی بخش اُنکا نام اور حقیر تخلص تھا ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی بنی بخش صاحب کو بھیجا اسکا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اُسکا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ والسلام ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا اسیر کیا غریب کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

ایک خط میں نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود، بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں + + + + امرائے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشنار۔ مہینے کا روزینہ دار بنکر نامردانہ مرگیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے میرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا، نہ دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا

بھائی مقتولوں میں آیا اُسکے پاس ایک پیسا نہیں تنکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو ملگیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے ماموں سب ساری املاک بیچ کر اور نوشجان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ مفیا الدولہ کی پانسو روپئے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلیجھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحا و زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُسکو بھی سچ جانو۔"

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُنکے خیالات معلوم ہوتے ہیں ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی رکاب میں پانو ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخشدیا تو خیر، اور اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور بادیہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "ہم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔

ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؛ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اٹھ جائے، اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے، ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے انکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ملے گا

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات بارد میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کے مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آوردکا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اسلیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے

کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفی عبارت مرزا خاصکر اُن خطوں میں لکھتے تھے جنسے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

یوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر یہ ایک شیوۂ فرسودہ اہنا لگے روزگار ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپیگا صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسکو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، قید حیات رہی نہ قید فرنگ"

اُنھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھو!

زہجران طفلے کہ در خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو

وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھو لیتے۔ ہاں مظفرالدولہ کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلی ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اور خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے خصوصاً مسجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیئے جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمایش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارودہ کے ہرگز خوش ہونیوالے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُسکو اب بھی بہت کم لوگ ناپسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفتہ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اسکے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اسکے بعد ایسی عمدہ نثریں کسی نے نہیں لکھیں۔

کتاب سراج المعرفتہ جس پر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے اُس میں منشی میر لال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و افکار جو آنحضرت کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کیے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و افکار کو معرفت الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے،

دیباچہ مذکور کا اوّل و آخر کا حصّہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے عنوان پر لکھا ہے "لا موثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لانیوالا اور اسکا راز بتانیوالا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں، آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیاے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو یہ حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں، اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے انکی نظر میں نہیں مگر جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی تدمگاہ پر آرہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا راز داں ہے۔ گفتگوے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کہ جس سے

اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔
نبی را دو وجہ است دلجوے خلق یکے سوے خالق یکے سوے خلق
بداں وجہ از حق شود مستفیض بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض
یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اسکے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل مستفیض پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں اب وہ ولایت کہ خاصہ نبی تھی نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا۔ اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روے کلمہ لا الہ الا اللہ مشہور عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایکبار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نور معرفت سے منور ہو جائے۔ اور وہ ضامن زبردست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کردے یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اُسکو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

لے کردہ بہ آرایش گفتار بسیچ ۔۔۔ ورزلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیا اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب استیلائے وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہرچند انکو سمجھائینگے راہ پر نہ آئینگے ناچار اشغال واذکار وضع کیے تا قوت متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جائے وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اسکو بجبر یا بہ تکلیف ثابت کیا چاہتے ہوں "دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست" + حاشیہ

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہوگیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بجر و فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جانکر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا انجام دونوں کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں مگر ہاں کم ہیں، اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بیشمار ہیں"

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی

اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اس زمانے میں کما حقہٗ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے، تو اب کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو اُنکی قدر جتائی جا سکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انکے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونہ پبلک کے سامنے پیش کر دیں، اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے اس لیے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوت متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی۔ سمجھدار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کر سکیں لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے نقاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ اُسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیاور دیگر اینجا بود زباں دانے　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر سا مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے جو اُن کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہیے لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوف، غلبۂ محبت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بیباکی، بیان رنج و مصیبت

وشکایت وزار نالی ، اظہار محبت وہمدردی ، حسن طلب ، یہ چند میدان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و مرقص واقع ہوا ہے ۔ بیشک یہ بات اُنکے عشقیہ مضامین واخلاق وموعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیونکہ عشق ومحبت اور تمام تعلقات ومعاملات عاشق ومعشوق کا بیان ۔ جیساکہ ظاہر ہے محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جسکو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ۔ ابا کرتا ہے ۔ برخلاف اسکے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا رشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الا ماشاء اللہ) اسی لیے انکے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی ۔ اخلاق وموعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دلآویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو دلوں میں گھر نہیں کرسکتا ۔ مگر اس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا ۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" اور اُسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا ۔ اور باینہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا ۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے اُستادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے ۔ یہ میزان جو ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے اسکو اُنکے کلیات نظم ونثر میں جانچنا چاہیے ، نہ انتخابی اشعار میں جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں ۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشاپردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد وسرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدردان

نہ تھا۔ اُنکے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان واعیان تھے جو فارسی زبان اور خاصکر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین وامرا وروسا تھے۔ جنکو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص جسکا قصیدہ انوری وخاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے جسکی غزل عرفی وطالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جسکی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں اسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا گورنمنٹ کے ارکان واعیان کی مدح کے جلد بعد مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو فوراً فروخت ہوکر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور انکے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلاشبہہ ملک میں بیشمار تھے مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُنکی تحسین وآفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو، اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جسکو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین وامرا کی داد ودہش سے پیدا ہوسکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اُسکا دل بڑھانیوالی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہی نخواہی اُسکو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں، اولاً سبق استعداد اور فطری قابلیت جسکا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اُسکو مستی

اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اسکے کہ ملک میں کوئی اسکی قدر کرے یا اسکے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اُس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقۃ سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹمار ہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دار الخلافۃ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضیل حق خیر آبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبد اللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفےٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا انکی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابو الفتح، فیضی، اور ابو الفضل کا انکے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اسلیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، اور انکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چین دونوں انکی ترقی کا باعث تھے۔

لطیفہ مولانا فضل حق باوجود علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اسکا اندازہ حکایت ذیل سے ہوسکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جاکر پوچھے۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اُسنے وہاں سے آکر مولانا سے کہا آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے، اور پھر وہ شعر پڑھا، اور جو کچھ مرزا نے اسکے معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟ اُس نے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُس نے سخت غلطی کی۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے۔

تو بدیں شیوہ گفتار کہ داری غالبؔ گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ۔ ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سنکر کہا کہ مومن خاں نے یہ اسلیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے انکو بمراتب برتر و بالاتر سمجھتے تھے نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسروؒ) سے ہوئی اور ایک ترک (یعنی مرزا غالب)

پر اُسکا خاتمہ ہوگیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیت کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بیشک مرزا کی طرز خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے، اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہوگیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اسکے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

باچنیں اندہ کہ پرگفتیم و دل خالی نشد — خواجہ گر اندہ گسار من نبودے۔ وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فن فرزانگی — متفق گردیدہ رائے بوعلی یارائے من
آنکہ چوں خواہد بنامش نامہ نامی ساختن — برنگارد عقل فعالش کہ مفرمائے من
دل بدیں وصفم نیارا ساید سخن کوتہ کنید — آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعال کا اسکو "کہ مفرمائے من" لکھنا یہ سب باتیں اسکی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں، مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اسکے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی

کے مکان پر۔ جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے، کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جسکے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جسکا مطلع یہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست　　فسونِ بابلیاں فیضے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اُٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے" یہ کہکر پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی انکی عادت تھی کہنے لگے "کلام مربوط ہے مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو ایکہ محوِ سخن گستران پیشینی　　مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

اسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔ صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اسلیے وہ مرزا کو اور مرزا انکو کم مانتے تھے لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُنکی اصلی ترقی کی بنیاد۔

غزل | معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں انکے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری،

نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہوگیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے۔ دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بیراہ روی مجھکو جتائی طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اسکو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔ اب اس گروہ والاشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلو میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر اُنکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی غزل میں نہ صرف نظیری بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور اُنکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ اُنکی غزل بلاشبہہ نظیری کی غزل سے زیادہ متانت رکھتی ہے۔ لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سربرآوردہ ہوا ہے اسکا نام لیا ہے۔ انکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ

فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اسلیے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں۔ ناظم کہتا ہے

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد لباطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید — سر چیتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سرمو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی تھی۔ ہم اس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جن کے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور انکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخاب غزلیات فارسی

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری (توحید) طرۂ پرخم صفات موی میان ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ پرخم

کیا ہوگا؟ صفات آلہی - اور اُسکا مے میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ شعرائے متصوفین صفاتِ آلہی کو اکثر زلف وگیسو اور طرہ وکاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ ماسوی اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں - اسلیے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوائے کو قرار دیا ہے -

آب نہ بخشی بزورِ خوں سکندر و بدر (توحید) جاں نہ پذیری بہیچ نقدِ خضر نارواں

بدر یعنی حلال - مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیوان کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا کہتا ہے کہ زور و حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا، پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہوجائے تو ہو دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے مگر تو اسکو قبول نہیں کرتا، اور اسلیے اسکو کسی طرح موت نہیں آتی -

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب (توحید) ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ حوادث و مصائب و آلام ہیں -

سادہ ز علم و عمل مہر تو ورزیدہ ام (توحید) مستیٔ ما پائدار بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا - دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں، یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں -

قطعہ

اے خاکِ درت قبلۂ جان و دل غالب — کز فیض تو پیرایہ ہستی ست جہاں را

تا نام تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن — در خویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آنحضرت کا نامِ مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی

کہ دل نے پیار سے اُسکو اپنے اندر اُتار لیا

ماہمائے گرم پرواز یم فیض از ما مجوے (فخریہ) سایہ ہمچوں دود بالامی رود از بالِ ما

یعنی ہمارے پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم (شوخی) آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ مجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دل بایوس راتسکین بمرد ن میتواں دادن (امید) چہ امید ست آخر خضر و ادریس و مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن (تصوف) زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

وقف تاراج غم لذت چہ پیدا چہ نہاں (عاشقانہ) ہمچو رنگ از رخ ما رفت دل از سینۂ ما

جوئے از بادۂ و جوئے ز عسل دار د خسلد (عاشقانہ) لب لعل تو ہم این ست و ہم آن ست مرا

خارہا از اثرِ گرمی رفتارم سوخت (فخریہ) منتے بر قدم راہ روان است مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے اُنکے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دیے ہیں اور آیندہ آنے والوں کے لیے راہ صاف کر دی ہے۔

رہروِ تفتہ در رفتہ بہ آبم غالب (حالت خود) توشۂ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا پانی کو دیکھکر بے اختیار اُس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے

پر اُسکا زادراہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض اُنکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

سایۂ وچشمہ بصحرا دم عیسے دارد (دنیا) اگر اندیشہ منزل نبود رہزن ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اسلیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

می پرد سور مگر جاں بسلامت ببرد (زراعت) کہ چہ برق ست کہ شد نامزد خرمن ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اُڑے جاتے ہیں تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

سخن ما زلطافت نہ پذیرد و تحریر (فخریہ) نہ شود گرد نمایاں زرخ توسن ما

یعنی ہمارے خیالات اسقدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اُٹھتا۔

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ (فخریہ) شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں۔

با بندۂ خود این ہمہ سختی نہ کنند (شکایت) خود را بزور برتو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہوگئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

بر روے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک (فخریہ) از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اسلیے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل درکشید — سر چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرو شد زکار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کردیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سرمو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی تھی۔ ہم اس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جن کے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور انکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہوسکتی۔

انتخاب غزلیات فارسی

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری (توحید) طرۂ پرخم صفات موی میان ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ خم

کیا ہوگا؟ صفات الٰہی - اور اُسکا موے میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف وگیسو اور طرہ وکاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ ماسوی اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں - اسلیے شاہد حسن حقیقی کی کمر ماسوائے کو قرار دیا ہے -

آب نہ بخشی بزور خون سکندر بدر (توحید) جاں نہ پذیری بہیچ نقد خضر ناروا

بدر یعنی حلال - مشہور ہے کہ سکندر آب حیوان کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا کہتا ہے کہ تو زور حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا، پس اگر سکندر آب حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہوجائے تو ہو دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے مگر تو اسکو قبول نہیں کرتا، اور اسلیے اسکو کسی طرح موت نہیں آتی -

بزم ترا شمع وگل خستگی بوتراب (توحید) ساز ترا زیر وبم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ حوادث ومصائب وآلام ہیں -

سادہ زعلم وعمل مہر تو ورزیدہ ام (توحید) مستئ ما پائدار بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا - دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں؛ یعنی گو علم وعمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں -

قطعہ

اے خاکِ درت قبلۂ جان ودل غالب — کز فیض تو پیرایہ ہستی ست جہاں را

تا نام تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن — درخویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آنحضرت کا نامِ مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی

کہ دل نے پیار سے اُسکو اپنے اندر اُتار لیا

ماہمائے گرم پرواز یم فیض از ما مجوے (فخریہ) سایہ ہمچوں دود بالامی رود از بالِ ما

یعنی ہمارے پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

حالِ ما از غیر می پرسی دمنت می بریم (شوخی) آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ مجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دل یاس رالتسکین بمردن میتواں دادن (امید) چہ امیدست آخر خضر دادر یس و مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ نسبتن (تصوف) زخود رفتیم و ہم باخویشتن بردیم دنیا را

وقف تاراج غم لست چہ پیدا چہ نہاں (عاشقانہ) ہمچو رنگ از رخ مارفت دل از سینۂ ما

جوئے از بادۂ و پیمانے زعسل دار دخسلہ (عاشقانہ) لب لعل تو ہم این ست و ہم آن ست مرا

خارہا از اثرِ گرمی رفتار م سوخت (فخریہ) ہفتے بر قدم راہ روان است مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے اُنکے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دیے ہیں اور آیندہ آنے والوں کے لیے راہ صاف کر دی ہے۔

رہبر و تقلید در رفتہ بہ آہم غالب (حالات خود) توشۂ برلب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا۔ پانی کو دیکھکر بے اختیار اُس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے

پر اُسکا زادراہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض اُکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

سایۂ چشمہ بصحرا دمِ عیسے دارد (دنیا) اگر اندیشہ منزل نبود رہزن ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اسلیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

می پرد سور مگر جاں بسلامت ببرد (زراعت) کما چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اُڑے جاتے ہیں تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد بتحریر (فخریہ) نہ شود گرد نمایاں زرمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اسقدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آ سکتے گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اُٹھتا۔

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب (فخریہ) شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں۔

با بندۂ خود این ہمہ سختی نمی کنند (اشکایت) خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

بر روے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک (فخریہ) از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھکر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنت دربستہ ہیں پس چونکہ ہماری جنت کی کیفیت سے اور جو اُس میں لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ بیخبر ہیں اسلیے رشک سے انکی یہ حالت ہے کہ گویا اُنپر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

سوز تراروں ہمہ درخویشتن گرفت (تصوف) از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے، اور ذرہ برابر کسی کے لیے اس میں سے حصہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغدار قرار دیتے ہیں درحقیقت اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

باچوں تو ئے معاملہ برخویش منت است (عاشقانہ) از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

روے سیاہِ خویش زخود ہم نہفتہ ایم (زارنالی) شمع خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

کدوئے چوں نئے یا بم چناں برخویشتن بالم (رندانہ) کہ پندارم سرآمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھکو ملجاتا ہے تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

سخن کوتہ۔ مرا ہم دل بتقوی مائل ست۔ اما (رندانہ) زرنگِ زاہدا فتادم بہ کافرمائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اسلیے میری کفار کی سی حالت ہے ورنہ تقوی کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

درمشرب حریفان منست خود نمائی (اخلاقی) ہنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ لفظی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اس سے مراد شراب خوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے اسکے ہاں آلہ خود نمائی یعنے آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا نہ تھا۔

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی (شوخی) بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اسکا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ، کیونکہ عہدِ وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد (عاشقانہ) ہزار بار برد صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے پس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے۔ کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو (متصوفانہ) متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا، اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے وہ مستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرف عالی لیکر آنا چاہیے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا، اسمیں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را (رشک) رشک نگذارد کہ گویم نام را

گشتہ در تاریکی رہ زم نہاں (زمانی) کو چراغے تا بجویم شام را

یعنی میرا وان اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اسکی تاریکی دونوں مل گئیں، اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود (خلوص) خوش بود گر دانہ نبود دام را

یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ (زمانہ) دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ولسال در نشتر و غالب بوسر جو شوق نشناسد ہے ہنگام را

در ہر طرب بیش کند تاب و تبم را (عاشقانہ) مہتاب کفِ مار سیاہ ست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامان عیش وطرب مہیا ہوتا ہے اس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش وطرب کی محرک ہے وہ میری رات کے حق میں مار سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا زغیرت جاں دہم (غیرت) گر بموج افتد گمانِ چین پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھکو یہ شبہہ بھی گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھکر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر جان دیدونگا مگر حلق تر نہ کرونگا۔

بپایان محبت یاد می آرم زمانے را (عاشقانہ) کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے، کہ اب انتہاے محبت میں جبکہ معشوق کی طرف سے ظلم وستم وبیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی۔ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اُسکو دیا تھا اسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات نہیں ہے، کہ جس طرح بیع وشرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لیجاتی۔

آوازۂ شرع از سر منصور بلند است (رندانہ) از شب روی ماست شکوہ عسس ما

شب روی۔ چوری کے لیے رالتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دیجائے تو شریعت کی شان وشوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

وقت ست کہ خونِ جگر از درد بجوشد (زاہدانہ) چندانکہ چکد از مژۂ داد رس ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچگئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خون جگر درد سے اسقدر اُبلے کہ حاکم داد رس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نہ تواں بود (آزادی) برقند۔ نہ بر شہد نشیند مگس ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہونے ہیں مگر اُن میں پھنستے نہیں، جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اُڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

بادۂ مشکبوی ما، بید دکنار کشت ما (رندانہ) کوثر و سلسبیل ما، طوبیٰ ما بہشت ما

حسرت وصل از چہ رو، چوں بخیال سرخوشیم (عاشقانہ) ابر اگر بایدت، بر لب جوست کشت ما

یعنی جبکہ ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے۔ ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بردہ صد لعین بسر بر سر صد ہزار خم (رندانہ) گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشت ما

بادہ اگر بود حرام۔ بذلہ خلاف شرع نیست (رندانہ) دل نہ نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بزشت ما

زاہد کی طرف خطاب ہے جو شراب خواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلاف شرع نہیں ہے، اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے اُس پر تو طعن مت کر۔

(تضمین مصرع طرح)

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ این غزل شاد بہیچ می شود طبع وفا سرشت ما

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، وصہبائی، وآزردہ، اور مومن اور نیر وغیرہم سب اس میں شریک ہوئے تھے اس مقطع میں مرزا نے مصرع طرح کو تضمین کیا ہے اب اسکے یہ معنی ہو گئے کہ تم سے جو اسطرح پر غزل لکھنے کی فرمایش کی گئی ہماری طبع وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

مردم زفرط ذوق و تسلی نہ می شوم (عاشقانہ) یارب کجا برم لب خنجر ستاے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا کہ اُسکی تعریف کرتا کرتا مر گیا، اور پھر بھی

تسلی نہ ہوئی۔ آلہی اس لب خنجر ستا کو کہاں لیجاؤں کہ جہاں جاکر تسلی ہو۔
شبم تاریک ومنزل دُور ونقش جادہ ناپیدا (زندانہ) بلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گا ہے را
پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شب تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برق شراب کی چمک پر جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اُس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آجاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی ملجاتی ہے صرف اُسکی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

مے باندازہ حرام آمدہ ساقی برخیز (زندانہ) شیشۂ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما
برخلاف عقل وشرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اُٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پہ دے مار۔ اس شعر میں افراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اُسکی خواہش کیجائے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھکر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں۔ پس گو کہ مضمون شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اسکا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

موبرآید زکف دست اگر دہقاں را (زارنالی) نیست ممکن کہ کشد ریشہ سراز دانۂ ما
ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس میں سے ریشہ نکل آئے، یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے
خراہیم ورضایش درخرابیہای ما باشد (تصوف) زچشم بدنگہدار دخدا ما دوست کا ماں را
خراب۔ مست، ویران، اور تباہ، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم

خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جنکی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے۔

بسا افتادہ۔ سرمست و بسا افتادہ در طاعت (مناجات) تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری گداماں را

عالم آئینۂ رازست چہ پیدا چہ نہاں (تصوف) تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اسکا ظاہر و باطن سب مظہر اسرار الٰہی ہے۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار (تصوف) نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجیب (شوخی) از حیا روے بما گر ننماید چہ عجیب

کہتا کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کر کے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کریگا کہ ہم اسکے دیکھنے سے محروم رہیں۔

بودش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن (شوخی) بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

باچنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد (تعدد) غالب از رخ برہ دوست نساید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔ (غزل نعتیہ)

حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمدؐ است — آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

آئینہ دارِ پرتوِ مہرست ماہتاب — شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است — اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

دانی اگر بہ معنی لولاک وار سی — خود ہر چہ ہست از حق ست ازانِ محمدؐ است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد — سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

واعظ احدیث سایۂ طوبی فسرو گزار — کاینجا سخن زسرو روانِ محمدؐ است
بگذر و نیمہ گشتن ماہ تمام را — کان نیمہ جنبشے زبنانِ محمدؐ است
غالب ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم — کان ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تخمیس ابتک شایع نہیں ہوئی اسلیے بمقتضاے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کیساتھ نقل کر دیا جاے۔

اعجاز از خواص لسانِ محمدؐ است — عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گر نور و گر ہدیٰ کہ ازانِ محمدؐ است — حق جلوہ گر زطرز بیانِ محمدؐ است
آرے کلام حق بہ زبانِ محمدؐ است

دانی زپیش چشم تو برخیزد ار حجاب — کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب — آئینہ دارِ پرتو مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ است

لطف خداست گر بسر کس نہاد دست — قہر خداست چوں زسر کین بجملہ جست
داند کسیکہ شد زمے مارمیت مست — تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں زکمانِ محمدؐ است

گوئی اگر بعالمِ ادراک وا رسی — بینی اگر بدیدۂ دراک وا رسی
سنجی اگر بمرتبۂ خاک وا رسی — دانی اگر بمعنی لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است

شاہد بقتل عاشق و عاشق بخال وخد — مجنوں بپاے لیلیٰ و لیلیٰ بہ فرق خود
مومن بہ آل احمد و آلش بروح جد — ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست میخورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

حمد و نعت و منقبت حق رود — از زبانِ نامور نشانِ محمدؐ است

اے خامہ وصفِ قامتِ معشوق کم نگار — اے دل سخن ز راست قداں درمیاں میار
قمری! از ذکرِ سرو و نفس را نگاہ دار — واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگزار
کاینجا سخن ز سرو روان محمدؐ است

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا — دیدی کہ بازگشتنِ خورشید بر قضا
بودہ است بر اشارۂ ابروی مصطفےٰ — بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز جنانِ محمدؐ است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود — وز آل و از صحابۂ امت سخن رود
واں کاینہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود — ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

ہمت بمدحِ شہ من و حالی گماشتیم — گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کامِ دل فراخور وصفش نداشتیم — غالبؔ ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

بیخود بوقت ذبح بتیدن گناہ من (شوخی) — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست
یا داز عدو نیارم و اینہم ز دوربینی ست (شوخی) — کاندر دلم گزشتن با دوست ہمنشینی ست

کہتا ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دوربینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئیگا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشین ہو جائیگا۔

من سوی او بہ بینم و اندر زیبائی ست (شوخی) — او سوی من نہ بیند دائم ز شرمگینی ست
چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ کمانِ تو نیست (عاشقانہ) — قیامت ست! دل دیر مہربان تو نیست
رواں فدای تو! نامے کہ بردۂ ناصح! (عاشقانہ) — زہے لطافتِ ذوقیکہ در میان تو نیست

چونکہ ناصح ترک عشق کی نصیحت کرتا ہے اسلیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی

طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو! تو نے کسکا نام لیا؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے یعنی جسطرح اسکا نام لینا چاہیے تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح نے بُری طرح سے اُسکا نام لیا تھا۔ اسلیے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

دل از خموشیِ لعلت امید وار چرا است (عاشقانہ) چہ گفتۂ بہ زبانے کہ در دہان تو نیست

معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اُسکی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اسکے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے۔ پس کہتا ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اسقدر کیوں امیدوار ہے تو نے اُس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے جس سے اُسکو اُمید بندھی ہے۔

گمان زیست بود بر منت زبید ردی (عاشقانہ) بداست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست (اخلاق) قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو اُلٹا ہے۔ اُس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا

"روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست"

مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جب ہی تک بیچین رہتا ہے جب تک کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بیچینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ

"قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست"

پاک خورا مروز زنہار از پے فردا مشہ (شوخی) در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جولوگ شراب طہور کی اُمید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اسکو کل کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس اُن سے کہتا ہے کہ "پاک خور امروز" یعنی سب آج ہی نبیڑ دے اور کل کے لیے مت رکھ، کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاویگی۔

زوہم نقش خیالی کشیدۂ ورنہ (تصوف) وجود خلق چو عنقا بد ہر نایاب است

قوی فتادہ چو نسبت۔ ادب مجو غالب (تصوف) ندیدہ کہ سوے قبلہ پشت محراب است؟

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر آداب ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ دیکھو! قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلاف ادب ہے، مگر محراب مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے

ہر چہ فلک نخواستہ است بیکس از فلک نخواست (شوخی) ظرف فقیر مے نہ جُست بادۂ ما گزک نخواست

بحث وجدل بجای ماں میکدہ جوی کاندراں (تصوف) کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

بجاے ماں بمعنی بجاے دار یعنی بحث وجدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جاکر وہاں جمل کا جھگڑا ہے نہ فدک کا قصہ ہے۔ جمل سے مراد جنگ جمل ہے جس میں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہوکر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجور کا باغ تھا جسپر حضرت سیدۃ النسا فاطمہؓ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا یہ دونوں جھگڑے منجملہ ان بیشمار نزاعوں کے ہیں جن پر سُنّی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹّول رہتی ہے۔

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن (فخریہ) رحمے مگر بجان حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب حاسدوں کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

غالب زباں بُریدہ و آگندہ گوش نیست (بیہودگی) اما دماغ گفت و شنو دش نماندہ است
بلبل! دلت بنالۂ خونیں بہ سد نیست (عاشقانہ) آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گُل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہمکو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

بیخود بزیر سایۂ طوبیٰ غنودہ اند (تصوف) شبگیر رہروان تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں ان کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا منتہاے مقصود طوبیٰ کے سایے میں آرام کرنا ہے۔

اختری خوشتر از نیم بہاں می بالیست (عاشقانہ) نرد پیر مرا بخت جواں می بالیست
تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نہ شود (قیمت سخن) نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بالیست
گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست (فخریہ) گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست
مشکین غزالہا کہ نہ بینی بہیچ دشت (فخریہ) در مرغزار ہاے خطا و ختن بسی ست
در صفحۂ نبود دم ہمہ آں چہ در دل ست (فخریہ) در بزم کمتر ست گُل و در چمن بسی ست
دراز دستیِ من جاکے ارفگند چہ عیب (رذالہ) زمبیش دلق درع باہزار پیوند است
نہ گفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر (رذالہ) بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیز دم دار (عاشقانہ) کہ بندہ خوبیِ او خوبیِ خداوند ست
درگرم روی سایۂ و سرچشمہ نجوئیم (تصوف) با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

یعنی ہمکو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ ست (تصوف) بردار نتواں گفت بہ ممبر نتواں گفت

کارے عجیب افتاد بدیں شیفتہ مارا (شوخی) مومن نہ بود غالبؔ و کافر نتواں گفت
گفتم زکہ پرسم اثرِ غم گزشتہ (رندانہ) ساقی بہ قدح بادۂ وہ سالہ فرو ریخت
در قالبِ ملّا اثرش پردہ کشا شد (شوخی) خاکے کہ قضا در تنِ کوسالہ فرو ریخت

گر منافق - وصلِ ناخوش - در موافق ہجرِ تلخ (دوستی) دیدہ و اغم کرد روے دوستاں دیدن مداشت
یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور اُن سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ جو منافق ہیں اُنکا ملنا ناگوار ہے اور جو نا موافق ہیں اُنکی جدائی تلخ ہے۔

بُردم آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت (انسان) ریخت مے بر خاک چوں جامِ گنجیدن نداشت
یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھا لیا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسمان کے لیے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُس کی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے۔ کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے

قفس و دام را گنا ہے نیست (تصوف) ریختن در نہادِ بال و پر ست
نہاد۔ جبلّت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اُسکے بال و پر گر جاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اُسکی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند (تصوف) ہم خزاں ہم بہار در گذر است
یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں، اُس میں پتے جھڑتے ہیں تو اس میں پھول جھڑتے ہیں۔

بے تو گر زیستہ ام سختی ایں درد بسنج (عاشقانہ) بگذر از مرگ کہ وابستہ بہنگامے ہست

یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معین ہے اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں۔ بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیونکر رہا اور کیونکر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم نخشد (رندانہ) در گرو گاں طلبد جامۂ احرامے ہست

رطل، پیمانۂ شراب۔ نبیذ، شراب، گرو گان، وہ شے جسکو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام، وہ بن سلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

نہ بدرستہ شرارے نہ بجا ماندہ رمادے (عاشقانہ) سوختم۔ لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد، راکھ۔ پہلا سوختم لازمی۔ دوسرا سوختم متعدی۔ کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اُس نے کس طرح مجھ جلا دیا، نہ کوئی چنگاڑا اڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

بادوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام (عاشقانہ) داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دار السلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے

دلخستۂ غمیم و بودمے دوا سے ما (رندانہ) با خستگان حدیث حلال و حرام چیست

(شوخی رندانہ) یعنی ہمارا اور معشوق دونوں کا

از کاسۂ گرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

نیکی ز تست از تو تخواہیم مزد کار (شوخی) ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اُسکی اُجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں۔ پھر سزا کس لیے ہے؟

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت (شوخی) پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اُس نے انکو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکے گی۔

لطفِ خدائے۔ ذوقِ نشاطش نمیدہد (عاشقانہ) کافردے کہ باستم دوست خوگرفت
یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو اُسکو خدا کی مہربانی میں بھی
مزا نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک
فیکٹ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ
سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی
معاشیق کی بے التفاتی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں مگر ہوا و ہوس
سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعث خوشنودی خدا ہے اُسکو
اختیار نہیں کر سکتے۔

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد (شوخی) بیچارہ بازداد و مے مشکبو گرفت
رموز دیں نشناسم درست۔ و معذورم (؟) نہاد من عجمی و طریق من عربی است
یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصول مذہب
سے واقف نہ ہوں تو مجھکو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاطِ جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم (ازرگ فضول) قدح مباش زیاقوت بادہ گرعنبی ست
دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی یعنی انگوری شراب چاہیے
جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو یا قوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ
شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست (فخریہ) عیار بیکسی من شرافتِ نسبی است
یعنی جسکو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی
میری مثل نہیں ہے اسلیے میری طرف کوئی مائل نہیں، اور یہی میری بیکسی
کی وجہ ہے۔

نشاطِ معنویان از شرانخانۂ تست (تصوف) فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست (تصوف) کہ ہر چہ رفت بہ عہد در زمانہ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گذرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

ہم از احاطہ تست اینکہ در جہاں مارا (تصوف) قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانہ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

سپہر را بہ تاراج ما گماشتہ (تصوف) نہ ہر چہ دزد زمانہ برد در خزانہ تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیماست (تصوف) نہ تیز گامی توسن ز تازیانہ تست؟

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے، اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالم بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

شباب و زہد! چہ نا قدردانی بستی ست (شوخی) بلا بجان جوانان پارسا ریزد

آخر منزل نخست خوی تو راہ می زند (تصوف) اوّل منزل دگر بوے تو زاد مید ہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذت قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثل زاد راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھواتی ہے۔

اے کہ بریدہ نم زنست و یکہ بسینہ غم زنست (تصوف) نازش غم کہ ہم زنست خاطر شاد می دہد

مستِ عطائے خود کند ساقی مانہ مستِ مے (تصوف) دادہ زیادہ می برد بسکہ زیاد می دہد
یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے
چونکہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اسلیے پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں اس کے
احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

دل اسباب طرب گم کردہ در بندِ غم نان شد (اخلاق) زراعتگاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویران شد
یہ مضمون مرزا کے حسب حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے
اول عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر۔ زراعت اور باغ کی مثال
کس قدر ممثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

زماگرم است ایں ہنگامہ ہنگر شورِ ہستی را قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد
یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے وہ انسان ہی
کے دم سے ہے۔ اگر حضرت انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرۂ می ریخت در جانہا نئے از لائے پالایش چکید و آب حیواں شد
لائے پالا صافی کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقم زنمک می خیزد مژدہ اے درد کہ ننگم ز دوا می آید
یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیونکہ نمک جو تیرے طول پکڑنے
اور ترقی پانے کا باعث ہے مجھے اُس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن
آئی ہے کیونکہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

ہمچو رازے کہ بمستی زدلِ آید بیروں (تصوف) در بہاراں ہمہ بویت زصبا می آید
اس شعر میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف
اشارہ ہے کہ انّ فی ایّامِ دہرِکم نفحات الا فتعرّضوا لہا۔

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد (آزادی) ولے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتہ (نقش) زچشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در لطف ایں قطعہ غالب (اشوفی) بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند (تصغیر) شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رنگ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند (تصغیر) دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند (فخریہ) ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند (فخریہ) بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند (فخریہ) بہ سخن ناصیہ فرکیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند (فخریہ) ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہر چہ در جزیہ ز گبران می ناب آوردند (رندانہ) بشب جمعۂ ماہ رمضانم دادند

ہر چہ از دستگہِ پارس بہ یغما بردند (زارنالی) تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اسکے عوض میں مجھکو۔ کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں۔ کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتشکدہ جلکر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بتخانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی شاہان عجم کے جھنڈوں کے موتی اُتار لیے اور اسکے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھکو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دیدیا۔ اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی وہ ماہ رمضان کی شب جمعہ کو مجھے پلائی۔ خلاصہ یہ کیا جو کچھ پونجی لوٹی تھی اُس میں سے زبان

مجھکو فریاد کرنے کے لیے دیدی۔

(عاشقانہ متصوفانہ)

خوباں نہ آں کنند کہ کس رازیاں رسد ۔۔۔ دل برد تا مگر چہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اسکے عوض میں کچھ اُس سے وصول ہوگا، کیونکہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

مقصود ما زدیر و حرم جز حبیب نیست (التصوف) ۔۔۔ ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

گم شد نشان من چو رسیدم بکنج دیر (التصوف) ۔۔۔ مانند آں صدا کہ بگوش گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دیر میں پہنچکر گم ہو جانے سے مراد فنا ہے۔ اسکی تشبیہ اُس صدا سے جو بہرے آدمی کے کان تک پہنچکر گم ہو جاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

(اعزاز نفس)

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس ۔۔۔ چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزاز نفس کا اظہار ہے۔ یعنی عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ اُمید نہ رکھو کہ میں دانے کی لالچ سے جال میں آپھسونگا، نہیں بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے، میں قفس میں فوراً چلا آؤنگا۔

تیر نخست را غلط انداز گفتہ ام (عاشقانہ) ۔۔۔ اے وائے گر نہ تیر دگر بر نشاں رسد

غلط انداز اُس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کر کے غیر مقصود جگہ جا لگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اسلیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُسکا آکر لگا، مگر میں اُسکو اپنی نخوست طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اسی جگہ لگا تو میں سمجھونگا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہو جائیگا اور امید بالکل باقی نہ رہیگی۔

اُمید غلبہ نیست بہ کیش مغاں درآے (رندانہ) ۔۔۔ گر بہ جزیہ دست ندادا رمغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہے تو اُنکا مذہب اختیار کرلے، کیونکہ اس صورت میں اگر شراب جزیے میں نہ آویگی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آویگی اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ واستیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبے کی امید نہ ہو تو لاچار کیش مغاں اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ وار مغاں ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

جاں بر سر مکتوب تو از شوق فشاندن (اعاشقانہ) از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد
آں کشتی بشکستہ ز موجم کہ بتابی (از زبان حال) افگند در آتش گراز آبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اسکے تختوں کو پانی سے نکالکر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

گر جلوۂ رُخ تو بہ ساغر نہ دیدہ ایم (تصوف) چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میرود
ہفت آسیا بگردش و مادر میانِ او (از زبان حال) غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

نجوا سودگی گر مرد راہی کاندریں وادی (دنیا) چو خار از پا برآمد۔ باز داماں بنی آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا اگر کانٹا پانوں سے نکل گیا تو پانوں دامن میں الجھیگا

برآر از بزم بحث اے جذبۂ توفیق غالبؔ (ترک) کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں بنی آید

ترک سادۂ ما یعنی غالب جو ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہاد من یعنی خود میں "با فقیہاں برنمی آید" یعنی مولویوں کی دلیلوں حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "با کسے برنیامدن" کے معنی ہیں اُس سے سر برآمد عہدہ برآنہ ہونا۔

چشم و دل باختہ ام - داد ہنر خواہد داد (تصوف) آنکہ چوں من ہمہ دان ہمہ بین تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھکو دیکھا ہے جیسا کہ تو ہے اسلیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دیگا جو میری طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا۔

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود (تصوف) پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود

رقتہ بودی دگر از جابہ سخن سازی غیر (عاشقانہ) منت از بخت کہ خاموشی ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی جس سے تجھکو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

دوش گزگردش بختم گلہ بر روے تو بود (عاشقانہ) چشم سوی فلک و روی سخن سوے تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا۔ ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے

دوست وارم گرہے راکہ بکارم زدہ اند (عاشقانہ) کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود

گر چنیں ناز تو آمادۂ یغما ماند (تصوف) بہ سکندر نہ رسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہ فاتح، اور دارا سے بادشاہ مفتوح۔

ہم بسودائے تو خورشید پرستم آرے (تصوف) دل زمجنوں بروآ ہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے جیسے مجنوں ہرنوں پر اسلیئے فریفتہ تھا کہ انکی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں۔

شکوۂ دوست ز دشمن نہ توانم پوشید (عاشقانہ) گر غم ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بیصبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا

جا سکیگا یہاں تک کہ اُسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکونگا۔

دربغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز (معیت) مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

بستند رہِ جرعۂ آبے بسکندر (تصوف) دریوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کر لے گیا۔ مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے یعنی خانقاہ کے ادنیٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ رضادہ (التفوت) تا تلخی آں زہر توانم بہ گلو برد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کروں۔

زجوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم (عاشقانہ) مباد مُہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اسکے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اسکو ضبط نہ کر سکوں مگر اسکو اسطرح بیان کرتا ہے کہ اسکی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ منہ پر جو مہر سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اسکے ریلے میں بہ نہ جائے۔

بریدہ ام رہِ دوری کہ گر بیفشانم (حقائقی) بجائے گرد رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہِ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جانے یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکر شعر اور تکمیل فن سخن میں قائل نے کی ہے۔

مکن بپرسشم از شکوہ منع کاین خونیست (عاشقانہ) کہ خود ز زخم دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور زاخیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو

اسوقت عاشق مہجور کا دل بھر آتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسش حال کے وقت شکایت سے مجھکو منع نہ کر کیونکہ تو جو پرسش حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد (سفر) زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

بوصل لطف بہ اندازۂ تحمل کن (عاشقانہ) کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں زسر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اسکی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مر جاؤں، کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گزر جائے۔

ہر کجا دشنۂ شوق تو جراحت بارد (تصوف) جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد

طوبیٰ فیض تو ہر جا گل و بار افشاند (تصوف) جز نسیمے بہ پرستش گہ مریم نہ رسد

جگر گوشۂ ادہم۔ یعنی ابراہیم بن ادہم۔ کو اُن زخموں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی۔ اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محراب مریم تک پہنچا ہے۔

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب (شوخی) پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوسِ میراث تمنا دارد (شوخی) وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اُردو

میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں۔ بڑا مزا ہوا گر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اسقدر بعید ہے کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہ ہوں۔

جان درغمت فشاندن مرگ از قفا ندارد (تصوف) تن در بلا فگندن بیم بلا ندارد
چوں لعل تست غنچہ اما سخن نداند (عاشقانہ) چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد
فارغ کسیکہ دل را با درد وا گزارد (تاباہی دوا) کشت جہاں سراسر وارد گیا ندارد
باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند (صوفی) آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند
کو فنا تا ہمہ آلایش پندار بَرَد (تصوف) از صور جلوۂ واز آئینہ زنگار بَرَد
عشوۂ مرحمت چرخ مخر کایں عیار (ستم بطف نما) یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار بَرَد

عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اسلیے نکالتا ہے کہ بازار میں لیجا کر بکوائے۔

ہر شمیمے را مشامے درخور است (تصوف) بوے پیراہن بکنعاں می رود
جوہر طبعم درخشا نلست لیک (زار نالی) روزم اندر پرہنماں می رود
نومیدی ما گردشِ ایام ندارد (زار نالی) روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
بلبل بچمن بنگر و پروانہ بہ محفل (بیقراری شوق وصل) شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

چہ خیز از سخنے کز درونِ جان نہ بود (سخن پوچ) بُریدہ بود زبانے کہ خونچکان نہ بود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیدہ زبان جو خونچکان یعنی درد دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔

حکیم ساقی دمے تند و من زبدخوئی (قیمت) زرطل بادہ بخشم آیم ارگراں نہ بود
حکیم سے مراد خدا ہے کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولت دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں

زخویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم (تصوف) کہ بازگردم وجزدوست ارمغاں نہ بود
قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات وہدیہ و ارمغاں لیکر وطن میں واپس آتا ہے کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آوں۔

زمام ناقہ بدست تصرف شوق است (تصوف شوق) بسوے قیس گرایش زساربان نہ بود
یعنی لیلیٰ کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اسوقت اُسکی باگ تصرف شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

بتان شہر ستم پیشہ شہر یار انند (عاشقانہ) کہ در ستم روش آموز روزگار انند
برند دل بادائے کہ کس گماں نہ برد (عاشقانہ) فغاں زپردہ نشیناں کہ پردہ دار انند
نہ زرع وکشت شناسند نے حدیقہ وباغ (عاشقانہ) زبہر بادہ ہوا خواہ بادو بار انند
یعنی ہوا اور مینہ کچھ اسلیے نہیں چاہتے کہ اُس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز وشاداب ہونگے بلکہ صرف اسلیے کہ شراب پینے کا لطف بغیر بادو باراں کے نہیں آنیکا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص اُنکی طبیعت کا اقتضا تھا۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اُسکے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جسکے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمد گزرگاہ

سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کی روکا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائیگا۔ مرزا ہنس کر چپکے ہو رہے۔

چہ لطف رہروی آنرا کہ خارخاری نیست (الفت سعدی) مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

خارخار خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کعبے کی راہ پُرامن ہے تو کعبہ جانا نہیں چاہیے۔ فی الحقیقت جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کر کے مقام مقصود تک پہنچتے تھے۔ جو خوشی انکو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اُسکا سواں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا جو ریل اور اسٹیمر میں آجکل سفر کرتے ہیں۔

(تاثیر سالی اپنا نے زباں)

بیا و رید گر ایں جا بلو د زباں دارد غریب شہر سخنہاے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اُس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اُسکی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اسلیے کہ کسی کو اپنا قدردان اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اسلیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا۔ اپنے تئیں غریب شہر۔ یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں کہنی چاہتا ہے۔

بپرسم ازاں بپرس کہ پرسی دلیل کوے (عاشقانہ) گویند خستہ زحمتِ خود زیں دیار بُرد
نازم فریب صلح کہ غالب زکوے تو ناکام رفت و خاطرِ اُمیدوار بُرد
ہرکرا رخت نمازے نبود از کرم مے (رندانہ) جائے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد
جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اُسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں
مفتیاں! بادہ عزیزست۔ مریزید بخاک (رندانہ) جو شد از پردۂ دگر خوں سیاوُش۔ مباد
دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے "مبادا خون شیاوُش۔ دیگر از پردہ بجوشد۔ سیاوُش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بیگناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اسکے خون کے وبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مفتیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اسکو زمین پر مت گراؤ، ایسا نہ ہو کہ خونِ سیاوُش پھر جوش مارے

از رشک کرد آنچہ بہ من روزگار کرد (شکایت چرخ) درخشگی نشاط مرا دید خوار کرد

یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی زمانے نے جب مجھکو دیکھا کہ خشگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب تو خوش نہ رہیگا۔

در دل ہمی زبینش من کینہ داشت چرخ (شکوہ چرخ) چوں دید کان نماند نہاں آشکار کرد

یعنی میرے دانش و بینش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج (تقدیر) دانا خورد در یغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر (شوخی) نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ماحصل شعر کا یہ ہے کہ درحقیقت میں ہوں تو نا اُمید مگر چونکہ تجھ سے نا امید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے راضی نہیں اسلیے مجبوراً اپنے تئیں امید وار بنایا ہے۔

بشرع آویز و حق میجو زمجنوں کم نہ بارے (تصوف) دلش باکحل است۔ امازبان باساربان دارد یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ، آخر تو مجنوں سے کم نہیں ہے کہ اُسکا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلیٰ سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر نوادر افکار سے ہے۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم بگذراز غالب (عاشقانہ) کہ ہم جاں برلب وہم داستاں باربزباں دارد

گفتم یعنی میں نے کہدیا ہے، میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگزر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اُسکی جاں لبوں پر ہے اور داستان زبان پر مبادا وہ اپنی دردانگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُسکی جان بھی نکلجائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر ناداں بندۂ کز خود فروشیہائے دیں بخشش زیزداں خوشتر کرد

صنعان کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق وفجور میں مبتلا ہوگیا۔ یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچگئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعان کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجب نادان بندہ ہے جسنے دین کی خود فراموشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا۔ یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اسکو بخشدیتا، اور اب جو وہ بخشا جائیگا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُس نے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ "خوش کردن"

کے معنی ہیں پسند کرنا۔

آں خود بہ بازی می بَرد۔ دیں را دو جَو می نشمرد (عاشقانہ) نمود مشدیں خندہ زد آورد مش جاں خوش نکرد

مامن میاویزاے پدر فرزند آزر را نگر (شوخی) ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد۔

میاویز۔ یعنی مجھ سے جھگڑا مت کر۔ فرزند آزر ابراہیم علیہ السّلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ہے، کیونکہ جہاں تک ہمکو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنّی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

درستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست (شوخی) آں کہ چندیں تکیہ بر حلم خداوندش بود

کہتا ہے کہ اُس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جسکو خدا کے حلم پر اسقدر بھروسا ہے کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ہے اور اسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا

باخرد گفتم نشان اہل معنی باز گوے (اخلاق) گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہرخواری بلکہ سرگرم تلاشم کردہ اند پارۂ نزدیک در ہر دُور باشم کردہ اند

دور باش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھکو جو قضا و قدر نے سرگرم تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے پس راہ تلاش میں جو دھکا مجھپر پڑتا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر دور باش پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

چرخ ہر روزم غم فردا بخوردن میدہد (زار نالی) تا قیامت فارغ از فکر معاشم کردہ اند

از چہ غالب خواجگیہاے جہاں تنگ نست گر نہ باسلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

بخشمم ناسزا میگوید و از لطف گفتارش گماں دارم کہ حرف دلنشینی بعد ازیں گوید

لطف گفتار کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہوسکتی۔ کہتا ہے

کہ معشوق غصے میں برابر مجھکو بُرا بھلا کہتا ہے مگر اسکے لطف کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے۔ اب کوئی مہربانی کا کلمہ اُسکی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو بروں آرم چمش جام خود انگارد وگر لختے برافشانم سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اُسکو پہلو سے نکال کر دکھاؤں تو جمشید اُسکو اپنا جام جہاں بیں سمجھے، اور اگر اُسکا ایک لختہ نکال کر ڈالدوں تو سلیمان اس کو خاتم سلیمانی کا نگیں بنائے۔

من بوفا مردم و رقیب بدرزد (عاشقانہ) نیمہ لبش انگبیں و نیمہ تبرزد

بدرزد یعنی نکل بھاگا۔ تبرزد مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو تباہ کرتا کرتا مرگیا اور رقیب نکل بھاگا گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اُس میں پھنسکر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اُس پر سے اُڑگیا۔

دعوے او را بود دلیل بدیہی (عاشقانہ) خندۂ دنداں نما بجسن گہرزد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اسکے دانت نظر آنے لگے۔ پس اُسکا خندہ گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں، اور اس دعوی کی دلیل اُسکا خندۂ دنداں نما ہے، کیونکہ اسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اسکے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پس اُسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

نہم جبین بدرش آستاں بگرداند (شکوۂ چرخ) لیشمنش بہ سر رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو اُلٹ کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رُخ

اوپر کر دیتا ہے۔

(استحلق آلہی)
تو نالی از خلۂ خار و تنگری کہ سپہر — سر حسین علی بر سناں بگرداند
برو بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا — چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند — کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند
تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد — شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اُتر جائے۔ پھر یہ سمجھکر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی میری زبان قلم ہو جیو۔

گر رفتہ ام ز کوے تو آساں نہ رفتہ ام — (عاشقانہ) ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد
ذوقیست ہمدمی بفغاں بگذرم ز رشک — خارِ رہت بپائے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں، مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اسلیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں خارِ رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد"

در تیغ زون منت بسیار نہادند — (عاشقانہ) بُردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اُتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اُتارا ہے۔

(وصف مے و مے نوشی)
روز یکہ بہ مے زور و بہ نے شور نہفتند — اندیشہ بکار خرد و ہوش نہ کردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا رد۔ دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور و دلیعت کیا تھا اس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تا جرِ شوق دراں رہ بتجارت نہ رود — (تصوف) کہ رہ انجامد سرمایہ بغارت نہ رود

یعنی شوق الٰہی کا تاجر اُس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اُس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد (تصوف) محرم آن ست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ۔ یعنی ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہیئے کیونکہ محرم راز وہی شخص ہے جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اُٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، غرضکہ ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

زاہد از حور بہشتی بجز ایں نشناسد (شوخی) کہ شود دست زد شوق و بکارت نرود

دست زد شوق ہونا یعنی شوق کے زیر مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے اُنکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارے و کنایے پر محمول نہیں کرتا۔

بیاد جوش تمنائے دیدنم بنگر (عاشقانہ) چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ۔ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اُسکو دیکھ۔ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوش تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"

زمن بجرم طپیدن کنارہ می کردی (عاشقانہ) بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد (تصوف) در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کے لیے ڈالا تھا وہ اُگا اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اس میں گھونسلے بن گئے۔ مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

اے ذوق نوا نجی بازم بخروش آور — غوغائے شبستانے بر تنگہ ہوش آور
گر خود نجہد از سر از دیدہ فسردہ بارم — دل خوں کن و آن خوں را در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہ ویرانہ — شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورابۂ ایں وادی تلخست اگر رادی — از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اے ہمدم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے میرے لیے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم کہ زرے داری۔ ہر جا گزرے داری — مے گر ندہد سلطان از بادہ فروش آور
گر مغ بہ کدو ریزد بر کف نہ مراہی شو — ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے، اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا۔ ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تو بنے میں ڈالدے تو تو بنا ہاتھ پر رکھ اور چلدے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں و مدار مینا رامش چکد از قلقل — آں در رہ چشم افگن ایں از پے گوش آور

رامش۔ راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل۔

گاہے بسبکدستی از بادہ زخویشم بر — گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہ ہوش آور

گاہے بسبکدستی۔ یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدہوش کردے اور پھر جب میں مست ہو جاؤں تو مجھکو گانا سناکر ہوشیار کر۔

غالب۔ کہ بقایش باد ہمپاے تو گرناید — بارے غزلے فردے زان موئہ پوش آور

ہمپاے تو یعنی ہمراہ تو۔ موئہ پوش اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے

یقین عشق کن واز سرگماں برخیز (عاشقانہ) بہ آشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

چرا بہ سنگ وگیاہی اے زبانۂ طور (الصوفی) زراہ دیدہ بدل در رود زجاں برخیز

زبانہ۔ شعلہ وہ تجلی جو سنگ وگیاہ۔ یعنی کوہ طور اور نخل ایمن پر ظاہر ہوئی تھی اُسکی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اتر اور جان سے بھڑک اٹھ۔

عیادت است نہ پرخاش تندخوئی چیست؟ (عاشقانہ) بیاد غمزدہ بنشیں، ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھکر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے، لڑائی کے لیے نہیں آیا، پھر یہ تندخوئی اور بدمزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہوسکتا ہے؟ پس آ اور مغموم بیٹھ۔ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اُٹھ۔

نفس چوں زبوں گردد دیو را بفرماں گیر (اخلاقی) محرم سلیمانم نقش خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہوگیا پھر اُن کو محکوم کرلینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرم راز ہوں، اُسکی انگوٹھی پر یہی کندہ تھا جس سے تمام جن اسکے محکوم تھے۔

بوسہ از لبانم دہ، عمر خضر از من خواہ (رندانہ) جام مے بہ پیشم نہ عشرت جم از من پرس

وردم بود غالب، یا علی بوطالب (منقبت) نیست نحل باطالب، اسم اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابن ابی طالب ہے، مجھکو طالب صادق سے کچھ نحل نہیں ہے، اسم اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی "یا علی" اسم اعظم ہے۔

رباعی: بخت ہرنگہ خفتگیں شناس (عاشقانہ) آرایش جبین شگرفان زچیں شناس

بے غم نہاد مرد گرامی نمے شود (اخلاقی) زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدمش (تصوف) دیدہ برخوابِ پریشاں زد جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھکر شامیانہ سا بن گیا ہے۔ اُسکا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا۔ اسکو جہاں سمجھ گئے اسی طرح اسکے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے مثلاً

وہم۔ خاکے ریخت در چشمم بیاباں دیدمش (تصوف) قطرۂ بگداخت۔ بحر بیکراں نامیدمش

بادِ دامن زد برآتش، نوبہاراں خواندمش (تصوف) داغ کشت آں شعلہ از سستی خزاں نامیدمش

چونکہ، نوبہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے۔ اسلیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا۔ میں نے اسکو بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا۔ تو میں نے اس کا خزاں نام رکھدیا۔

(تعریض براہلِ وطن)

غرتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدمش کردتنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہونچنے لگیں تو میں اسکو وطن سمجھا۔ گویا جب دام کے حلقے نے تنگی کی تو میں اسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری و نائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھکو راس نہ آیا تو میں نے اسکو بھی وطن ہی تصور کرلیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش (عاشقانہ) رفت از شوخی بآئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اُٹھکر اس طرح چلا گیا کہ میں اُسکو جان کہہ اُٹھا۔ یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اسکے جانے سے ہوئی۔

دل زباں را راز دان آشنائیہا نخواست (عاشقانہ) گاہ بہماں[1] گفتنش گاہے فلاں نامیدش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم کعبہ دیدم۔ نقش پائے رہرواں نامیدش
دل درغش بسوز کہ جاں می دہد عوض ور جاں دہی۔ غمے بہ ازاں می دہد عوض
نبود سخن سرائی مارائگاں۔ کہ دوست دل می برد زماؤ زباں می دہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہمکو مفت نہیں ملی ہے۔ بندہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اسکے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقۃ جب تک انساں کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہوسکتی، خواہ عشق مجازی ہو خواہ عشق حقیقی۔

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ (رندانہ) ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در دہست (رندانہ) ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ
چمن پُر از گل و نسریں و لربائی نیست (تصوف) بدست فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسریں سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دیدہ و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ اس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ ہوتا ہے اور اسکی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

---

[1] ہماں اور فلاں دونوں مرادف یکدیگر ہیں۔ جب کسی کا نام صراحۃً نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اُردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص یا امکاڈھمکا بولتے ہیں ۱۲۔

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا (تصوف) زمیوہ تا نہ فتد خود زشاخسار چہ حظ

یعنی جبکہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے۔ یعنی جب تک جاذبۂ عنایت ہمکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھاے۔ ہمکو کیا فائدہ؟

نہ مراد دولت دنیا۔ نہ مرا اجر جمیل (شکایت) نہ چو نمرود لوانا۔ نہ شکیبا جو خلیل

بُنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ (لکھنؤ) آنکہ دانست سرا سیمگی صبح رحیل

بُنہ و بار۔ ساز و سامان۔ شبگیر پچھلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے۔ وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را (زندان) اے بہ ترسا بچگان کردہ مے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ یعنی ظاہر میں۔

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری (ناقدری) یہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

ندانند نظیری ز قتیل۔ یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے۔

شعلہ چند غم کرا کل شگفد مزد کو؟ (غزہ) شمع شب تابیم۔ باد سحر گاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں گویا شمع شبستانی ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی نہیں۔ اور گویا میں باد سحر گاہی ہوں جو پھولوں کو کھلاتی ہے مگر اُسکی اُجرت کوئی ادا نہیں کرتا۔

از صنف طالبان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ (شوخی) زود زکو نگذرد کوکبہ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گزرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے ستھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

جذب تو باید قوی کاں ببرد تاک نیست (تصوف) گر نہ تواند رسید بخت بہ ہمراہیم
کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے جو مجھکو منزل تک لیجائے۔ پس نصیب اگر میرے
ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس (فخریہ) ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم
برلب یا علی سرائے۔ بادہ روانہ کردہ ایم (ردانہ) مشربِ حق گزیدہ ایم عیش بغانہ کردہ ایم
روانہ کردہ ایم۔ یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چونکہ لب پر یا علی جاری ہے اس
لحاظ سے تو ہم نے مذہب حق اختیار کیا ہے، اور چونکہ اس پر شراب جاری ہے
اس لحاظ سے مغوں، یعنے آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں۔ یعنی دین و دنیا
دونوں ہمکو حاصل ہیں۔

بادہ بوام خوردہ و زر بہ قمار باختہ (ردانت) وہ کر زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم
یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو بڑا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی
کے ساتھ نہ کیا۔ شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوے میں۔

نالہ بلب شکستہ ایم۔ داغ بدل نہفتہ ایم (کتمان عشق) دولتیان ممسکیم زر بخزانہ کردہ ایم
نالہ بلب شکستہ ایم۔ یعنی اسکو منہ سے نہیں نکلنے دیتے، اور ضبط کرتے ہیں اور داغ
کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں، ہم دولتمند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے
میں رکھتے ہیں۔

گر ز اموشی بفریادم رسد۔ وقتست وقت (تصوف) رفتہ ام از خویشتن چندانکہ دریادِ خودم
کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو لڑ گیا ہوں مگر ابھی آپے کو بھولا نہیں ہوں
اگر فراموشی اسوقت میری فریاد کو پہنچے اور آپے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے

ہر قدم لختے ز خود در فتن بود در بارِ من ہمچو شمع بزم در راہ فنا زادِ خودم
کہتا ہے کہ راہ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار۔ یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف

یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہ فنا میں آپ ہی اپنا زاد راہ ہے۔ کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زاد راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے اسی طرح میں بھی آپ اپنا زاد راہ ہوں۔

یاد باداں روزگاراں کا عتباری داشتم (عاشقانہ) آہِ آتشناک و چشمِ آشکباری داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتشناک تھی اور آنکھ اشکبار۔

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف برطرف (بیخودی) ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ایں چہ شور است کہ از شوق تو در سر دارم (عاشقانہ) دلِ پروانہ و تمکین سمندر دارم

آں چرا در طرب و ایں چرہ در تعب است (تصوف) خندہ بر غفلتِ درویش و تو انگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور تونگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لیے ہے؟

رازدارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ (مناجات) ہم سپاس از تو و ہم شکوہ زاختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اُسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس درحقیقت تیرا احسان مند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

خوشنودم از تو و زپے دورباشِ خلق (عاشقانہ) آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھکو جفاکار اسلیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ درحقیقت میں تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

دو زندگر بفرض زمیں را بہ آسماں (فقر) حاشا کزیں فشار دراید و خم افگنم

ہم بعالم زاہل عالم برکنار افتادہ ام (اسوس مصطفیٰ فخر) چوں امام سجدہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر تنکنی گر لباس دیں دارم نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں جنکو متشرع اور متقدس سمجھکر اُنکے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر انکو ذرا ٹٹول کر دیکھیے تو وہ ٹیٹ کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ و ہنوز ہزار درد بہر گوشہ در کمین دارم

ہنوز کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اُردو میں "تاہم" باوجود اسکے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو، مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چُراتے ہیں میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

زوعدہ دوزخیاں رافزوں نیاز ارند (توقع) توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعادِ معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھیں گے، پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں یعنی یہ کہ آہ آتشین بھی ہمیشہ نہ رہیگی۔ اس توقع کو عجیب اسلیے کہا ہے کہ اُسکو بھی دوزخ پر قیاس کرکے اُس سے آخرکار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے جسکا پہلا اصل مصرع یہ ہے،

مرا بہ سادہ دلیہای من تواں بخشید

نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے، مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اسکو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا۔ مگر میں نے اس پر ایسی غزل لکھی ہے

کہ اپنی اس خطا پر آفریں کا اُمید وار رہیں۔

(غزل مسلسل عاشقانہ)

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں ملکر پلٹ دیں اور حکم قضا کو رطل گراں۔ یعنی جام شراب۔ کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشۂ بنشینیم و درفراز کنیم　　بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

درفراز کنیم۔ یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسی کو نہ آنے دے۔

اگر سخنہ بود گیرو دار نستدیشم　　وگر زشاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم　　وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم وگلابے بہ رہگذر باشیم　　مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطربِ ساقی ز انجمن رانیم　　بکار و بار زنے کارواں بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیا میزیم　　گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ۔ تملق و خوشامد۔ سخن کو ادا کے ساتھ ملانا۔ راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہم شرم بیک سوو باہم آویزیم　　بشوخی کہ رُخ اختراں بگردانیم

زجوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم　　بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں، اور اُسکو طلوع نہ ہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹالدیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　زنیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈالدیں یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت ادھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بچنگ باج ستانانِ شاخساری را تہی سبدز ورگلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں انکو لڑکر باغ کے باہر ہی سے خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بہ صلح بال فشانان صبحگاہی را زشاخسار سوے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آکر کلیل کرتے ہیں انکو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

زحیدریم من وتو۔ زما عجب نہ بود گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار سے معجزۂ ردالشمس ہوتا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت برما اپچہ خود ما خواستیم (ندامت) وایہ از سلطان بہ غوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور وغل کرتا ہے تو اسکو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے کہتا ہے ہمپر جو سختی گزری وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی، کیونکہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا، اسلیے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔

دانش وگنجینہ پنداری یکے ست (فخر) حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ جو چیز ہم نے علانیہ مانگی۔ یعنی دولت۔ وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر دی۔ یعنی علم ہنر۔

رفت وباز آمد ہما در دامِ ما (تصوف) باز سرداد یم وعنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن پھنسا، اب چاہیے تھا کہ اُسکی زیادہ نگرانی کرتے اور اُسکو نکلنے نہ دیتے، مگر ہم نے اسکو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولت دنیا، اور عنقا سے مراد احدیت ذات۔

وختے در سفر از برگ سفر داشتہ ایم (آزادی) توشۂ راہ۔ ولے بود کہ برداشتہ ایم
داغ احسان قبولی لیمانش نیست (فخر منصور شکوہ) ناز بر خرمی بخت ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمی بخت ہنر۔ یعنی ہر ہنری بخت ہنر۔ کہتا ہے کہ ہم اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے اس پر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے

زخم جگرم بخیۂ و مرہم نہ پسندم (فخر منصور شکوہ) موج گہرم جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آب گہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے۔ نہ میرے کمال کی اطلاع ہے۔

نقد خردم سکۂ سلطان نہ پذیرم (فخر) جنس ہنرم گرمی بازار ندانم
غالب نبود کوتہی از دوست۔ ہمانا (شکر) زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھکو شعور نہیں ہوتا کہ کیونکر یہ کام بن گیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفےٰ مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اُس میں پڑھی گئی تھی چونکہ دلی کے تمام نامور شعرا کا، جو وہاں فارسی غزلیں لکھکر لیجاتے تھے۔ مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اسلئے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کیجاتی ہے۔

ہاپری[1] چہرہ غزالاں وز مردم رم شاں (عاشقانہ) دل بمردم نخم طرۂ خم در خم شاں

---

[1] یعنی زہے پری چہرہ غزالاں۔ ۱۲

کافرانند جہاں جوے کہ ہرگز نہ بود (عاشقانہ) طرۂ حور دلاویز تر از پرچم شاں
آشکارا کش، بدنام و نکو نامی جوے (عاشقانہ) آہ ازیں طائفہ، وانکس کہ بود محرم شاں
رنگ بر تشنہ تمنا رو داری دارم (عہد تحصیل) نہ بر آسودہ دلان حرم و زمزم شاں
بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی - ہشدار (اخلاقی) خستگانند کہ دانی و نداری غم شاں

یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے جنکو تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جنکو تو جانتا ہے مگر اُنکا کچھ غم تجھ کو نہیں۔

داغ خوں گرمی ایں چارہ گرانم ما گوئی (بیدردی طلبا) آتش است آتش اگر پنبہ و گر مرہم شاں
ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم (ذکر معاصرین) چہ بمانند بسیار نہی از کم شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور - کہ بود باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی - وانگاہ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شاں

مومن - یعنی حکیم مومن خاں جنکے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں
نیر - یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو جنکا کلام دونوں زبانوں میں بقدر معتدبہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی یعنی مولانا امام بخش جنکی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپکر شایع ہو چکی ہیں علوی مولانا عبداللہ خاں علوی اُستادِ مولانا صہبائی جنکی نظم و نثر فارسی چھپ چکی ہے، اور عربی میں بھی انکے قصائد موجود ہیں۔ حسرتی - نواب محمد مصطفےٰ خاں رئیس جہانگیر آباد - جنکے دیوان اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں، اور اُس کے سوا سفرنامۂ حج تذکرہ گلشن بیخار، اور رقعات فارسی بھی انکی تصانیف سے شایع ہو چکی ہیں - آزردہ - مولانا مفتی

---

۵ محبت و ہمدردی ۵ خوش نفساں یعنی سخنور انند - ۱۲

محمد صدرالدین خاں جنکا کلام اُردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اُس میں سے بہت کچھ ضائع ہوگیا ہے لیکن بعض مذہبی رسالے جو اُن سے یادگار رہ گئے ہیں شائع ہوچکے ہیں۔

تازد یوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن (فخریہ) ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است (فخریہ) شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا (فخریہ) چاکہا ایشار جیب پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت (فخر) دستگاہِ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاق فتنہ میں جگہ پائیگا۔ یعنی فتنہ کو پسند آئیگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کریگا، اور دونوں اپنی اپنی جگہ اس پر فخر کرینگے اور ایک دوسرے کو جھٹلائینگے اور آپس میں گل خپٹ ہونگے۔

ہے چہ میگویم اگر اینست وضع روزگار (اخبار شاعری) دفترِ اشعارِ باب سوختن خواہد شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور دُوں ہوگا، پھر کہتا ہے کہ ہے ہے میں کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعرِ باب سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ہو جائیگا۔

چشم کور آئینہ دعوی بکف خواہد گرفت (اخبار شاعری) دستِ شل شاطہ زلفِ سخن خواہد شدن
شاہد مضمون کہ اینک شہری جانِ دست روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آیندہ یہ حال ہوگا کہ شاہد مضمون جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کیجاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں گے اور انکی تہ کو کوئی نہ پہنچیگا۔

زاغ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پرزناں (انجام شاہوی) ہم نوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن
جنگلی کوّے (یعنی تک بندی کرنیوالے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے
ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں کی) برابری کرینگے۔
شاد باش ایدل دریں محفل کہ ہر جا نغمۂ ایست (انجام دنیا) شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن
اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے۔ یہ سب نغمے موزوں
ہوں یا ناموزوں ایک دن موت کے نوحے بنجائینگے۔
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید (انجام دنیا) ہم بساط بزم مستی پرشکن خواہد شدن
گرد پندار وجود از رہگذر خواہد شست بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن
کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا
یعنی سب فنا ہو جائینگے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذات واحد کے
سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔ (ترجیح کافر پر مسلمان)
دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو
کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اسکے پاس جاتی ہے جو
اسکے لائق ہوتا ہے پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیمان ہو اور وہ دولت
کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر تو نہیں ہوسکتا۔ لاچار مسلمانی پر قناعت کر
غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیہ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک
بڑا مرتبہ مراتب فقر و درویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں
کے اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسب حال بھی
ہو سکتے ہیں۔ شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں، مگر ضرور
ہے کہ انھیں کے نتائج افکار میں شمار کیے جائیں۔ کیونکہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد
ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی

سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا۔ جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے۔ یہ تو بہت آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اُسکی بھلائی انکے بغیر دشوار معلوم ہو۔ اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن تشنیع سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بدمذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیراندیشی سے دست کش نہ ہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروروں میں ایک ایسا فرد دنیا کے عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے مدار اس بات کا کہ خود ہماری قوم میں حسن اتفاق سے اسوقت ایک شخص موجود ہے جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ دلچسپ نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جس نے کافر، ملحد، نیچری، دجال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیرخواہی سے دست بردار نہ ہوا۔

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نہ تواں گشتن (خطاب بہ اقتدار) جوئی! بہ خیاباں رو سیلی! بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برائے نام جاری ہوجانے سے قلزم نہیں ہوا جاسکتا۔ اے مخاطب تو ایک نالی ہے۔ باغ کی کیاریوں میں جا، اور ایک رو ہے جنگل کی راہ لے۔ یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے جو کسی فن میں تھوڑی سی شدبد حاصل کرکے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ درگوے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو

کیونکر جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں اور باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

(صبر و شکیب)
دربند شکیبائی مردم زجگر خائی — اے حوصلہ تنگی کن۔ اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مسوستا مرگیا۔ یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلہ تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہو جا، اور اے غم تو زیادہ ہو جا، تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے، اور کھل کھیلوں اور جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

(شکایت)
سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر — برخرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اوّل سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغے کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینھ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے۔ جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں اور اُسکو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایت طریقانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں۔

(غزل مسلسل عاشقانہ)
بتے دارم از اہل دل رم گرفتہ — بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن اگلتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے۔

زسفاک گفتن چو گل برشگفتہ　　دریں شیوہ خود را مسلم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلم الثبوت مانے ہوے ہے۔

فسوں خواندہ وکار عیسیٰ نمودہ　　پری بودہ وخاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہوکر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

دمش رخنہ در زہد یوسف فگندہ　　غمش گندم از دست آدم گرفتہ

دم سے مراد بات ہے۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اسکے غم میں آدم کو گندم جیسی چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے طعنہ بر لحن مطرب سرودہ　　گہے خردہ بر نطق ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد گشتہ برہم نہادہ　　ببازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

برویش زگرمی نگہ تاب خوردہ　　بکویش برفتن صبا دم گرفتہ

نیارد زمن ہیچ گہ یاد ہرگز　　مگر خوے خاقان اعظم گرفتہ

ظفر کز دم اوست در نکتہ سنجی　　کہ غالب بآواز عالم گرفتہ

یہاں دم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آواز عالم گرفتہ۔　　(غزل سلسل در توحید)

چوں زبانہا لال و جانہا پُر زغوغا کردۂ　　بایدت از خویش پرسید اینچہ با ما کردۂ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جبکہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کردی ہیں اور باوجود اسکے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے۔ اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گرنہ مشتاق عرض دستگاہِ حسن خویش "جاں فدایت" دیدہ از بہر چہ بینا کردہ
ہفت دوزخ درنہا دشرمساری مضمر است انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں۔ پس اگر تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اسکو بخشدیا تو عین انتقام ہے، وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشا دآزا کہ ہم امروز رخ نمودہ مژدہ باد آزا کہ محو ذوق فردا کردہ
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردہ بادرستاں گر نوازشہائے پیدا کردہ

خستگاں زخمی اور شکستہ دل لوگ۔ یعنی جن کی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اُنپر خدا کا غصہ ہے۔ درست صحیح وسالم کو کہتے ہیں، درستان اس کی جمع ہے یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے گویا ان پر خدا کی عنایت ومہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمہ نوشست از زہر عتابت کام جاں تلخی مے در مذاق ما گوارا کردہ

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے، اور اُسکو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں۔ اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُسکو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ آریک گوہرست خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کرکے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے،

تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں۔ یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ درسنگ وگیاہ ورنج با جاندار بود　　پیش ازاں کیں درسد آزا مہیا کردہ

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ وگیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا، پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ وگیاہ کو مہیا کر دیا۔ جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ میگرید، زباں می نالد ودل می تپید　　عقدہ ہا از کار غالب سر بسر وا کردۂ

مقطع میں پھر اپنی عادت کے موافق شوخی کی ہے۔ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گذر رہی ہیں اُنکو از راہ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زبان فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے، گویا تمام عقدے تو نے حل کر دے ہیں۔ چونکہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا، ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے اسلیے اِن تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روے، زبان فریاد کرے، اور دل تڑپے، پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے وہ تو نے سب حل کر دیے۔

(غزل مسلسل عاشقانہ)

تا بم زدل بُرد کا فرادائے　　بالا بلندے کوتہ قبائے

چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے　　چوں جاں شیریں اندک وفائے

در کام بخشی ممسک امیرے　　در دل ستانی برہم گدائے

گستاخ سازے پوزش پسندے　　طاقت گدازے صبر آزمائے

ازخوے ناخوش دوزخ نہیبے　　وزروے دلکش مینو لقائے
زردشت کیشے آتش پرستے　　برسم گزارے زمزم سرائے

برسم۔ جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت یا نہانے، یا کھانے کے وقت انکو ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں برسم گزار اور زمزم سرائے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

درکینہ ورزی تفسیدہ دشتے　　در مہربانی بستان سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

اززلف پرخم مشکیں نقابے　　از تابش تن زریں ردائے

یعنی زلف پرخم اسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دمک سے سنہرا معلوم ہوتا ہے۔

درعرض دعوے لیلےٰ نکوہے　　بر رغم غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعوی حسن وجمال کرتا ہے تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ بڑا عاشق صادق تھا۔

توکے زجور پشیماں شدی چہ گوئی (عاشقانہ) دروغ راست نمائی کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ میں ظلم سے پشیمان ہوگیا ہوں" تو کب پشیمان ہوا ہے کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو۔ جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی باز (عاشقانہ) نگاہ مہر فزائے کہ داشتی داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے، پھر بھی

تیری نگاہِ مہر فزا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے

عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں (عاشقانہ) خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب (شکایتہ و گلہ) ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی داری

بیہودہ نیست سعی صبا در دیار ما (التصوف) اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی
یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ (عاشقانہ) اے طرفِ جوئبار چمن جائے کیستی

جائے کسے سبز بودن - اسکی جگہ کا خالی رہنا - اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں - طرف جوئبار - کنارہ جوئبار چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھکر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبار چمن تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے - کیونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اسلیے بطور شگون نیک کے اول یادش بخیر کہکر پھر سوال کرتا ہے -

نشنیدہ لذتِ تو فرومی رود بدل (التصوف) اے حرف محو لعل شکر خائے کیستی
از ہیچ نقش غیر نکوئی ندیدۂ اے دیدہ محوِ چہرۂ زیبائے کیستی
با ہیچ کافر ایں ہمہ سختی نہ می رود اے شب بمرگِ من کہ تو فردائے کیستی

بمرگ من - یعنی اے شب تجھکو میری موت کی قسم - چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اسلیے رات کو اپنی موت کی قسم دیکر پوچھتا ہے کہ تو کس کی فردائے قیامت ہے؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزری ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گزرتی ہوگی - پھر تو کافر سے بھی بڑھکر کون سے گنہگار کی قیامت کا دن ہے، بتا تو سہی؟ (غزل مسلسل عاشقانہ)

یکبار گفتم ندہی دادِ دل - آرے ندہی تا چو من دل بمغان شیوۂ کارے ندہی
چشمۂ نوش ہمانا نہ تراود زدلے کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

کہتا ہے کہ اُس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں ٹپک سکتا جسکو کہ تو کھینچکر تصور

میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشق مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا اس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ وخورشید دریں دائرہ بیکار نیند　　تو کہ باشی! کہ بخود زحمتِ کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے۔

سر براہ دم شمشیر جوانی نہ نہی　　تن بہ بندِ غم فتراک سوارے ندہی

خوں بذوق غم یزداں نشناسی نخوری　　دیں بمہرِ حق الفت مگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حق الفت مگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخر کار نہ پیداست کہ در تن فسرد　　کف خونے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن ٹھٹھر جانا خشک ہو جانا۔ یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کریگا مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہ جائیگا۔

حیف گر تن بسگانِ سرِ کوے نہ رسد　　وائے گر جاں بسرِ راہ گذارے ندہی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند　　نقد ہوشے کہ بسودائے بہارے ندہی

بخمِ طرۂ حورانِ بہشت آویزند　　ناز پروردہ دلے را کہ بیارے ندہی

گر تنزل نہ بود ابر بہاری غالب　　کہ دُر افشانی و زافشاندہ شمارے ندہی

یعنی اگر اس کنے میں تیری کسر شان نہ ہو تو اے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور انکی گنتی نہیں بتاتا یعنی بیشمار موتی برساتا ہے

دریا ز حباب آبلہ پائے طلب تست　　(تصوف) نورِ نظرائے گوہر نایاب کجائی

شورست نواریزیِ تارِ نفسم را　　پیدا نہ اے جنبش مضراب کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے نغمے نکل رہے ہیں انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے۔ مگر اے جنبشِ مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کسیں پتا نہیں۔

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں ید بیضا (فخرؔ) غالب بہ سخن صاحب فرتاب کجائی

فرتاب کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں کو مانتے ہیں۔

دیدہ ور۔ آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری (نقوش) در دل سنگ بنگر د قیصِ بتانِ آزری

دیدہ ور۔ یعنی صاحب نظر وہ شخص ہے کہ جب اسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دلربا ہیں تو وہ انگھڑ پتھر کے اندر بتانِ آزری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اس پر ظاہر ہو جائے

اے کہ تو ہیچ ذرہ را جز برہ تو روی نیست (نقوش) در طلب تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جناب احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھیے اسکا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اسلیے تیری راہ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اُسکا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ہر کہ دست در برش داغ تو رویش دل (نقوش) تا چو بدیگرے رہد۔ بازبری بداوری

کہتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اسکے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے، اور یہ اسلیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگا لے تو اس حجت سے کہ تیری نشانی اس پر موجود ہے۔ وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری۔ جھگڑا۔ مٹنا۔ اور محبت۔

رشکِ ملک چہ وچرا؟ چوں تو رہ نمی برد (نقوش) بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جبکہ وہ بھی بیفائدہ تیری تلاش میں پرواز

کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

حیف کہ من بخوں تپم۔ وز تو سخن رود کہ تو (اشک) اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبے کمی (اشعار فارسی) طوبیٰ اگر زمن شود ہمیہ کشم زبے بری

یعنی میری شومی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھے ملجائے تو اس میں کمی باقی نہ رہے اور مجھے اُس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور اگر طوبیٰ میری ملک ہوجائے تو وہ ایسا بے برہو جائے کہ اُسکی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل (حالت فکر شعر) غالب اگر دم سخن رہ بضمیر من بری

کہتا ہے کہ اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالت درونی کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے آگ کی رَو بہتی ہوئی تجھکو نظر آئے۔ یہ اُس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہونگے۔ ان میں سے کسی قدر اشعار۔ جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ ہوئے بطور نمونے کے یہاں نقل کردیئے گئے ہیں تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بنظر غور دیکھیں۔ وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھکر اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور انکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے

اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے، یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر میں زیادہ گنجایش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اسلیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے۔ کہ اسوقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں۔ کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پاخفتست اور بلاخفتست ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نوبیت کی ہے جس میں سے ایک شعر چھوڑا نہیں گیا۔ اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے اسلیے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں لیجائینگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہوسکے اور بعد موانے کے باقی اشعار بھی نقل کر دیے جاوینگے۔

نظیری	غالب
نظر بنظاہرہ صیاد و رخفا خفتست	بواد یے کہ دراں خضر را عصا خفتست
اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست	بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعۃً پیدا ہو جاتا ہے جسکا شان گمان تک نہیں ہوتا ایک معمولی حالت کے پیرائے میں۔ جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گذرتی رہتی ہے۔ بیان کیا ہے نظیری کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہت صاف اور نیچرل ہے اور گویہ مطلع اسکے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہوسکتا۔ لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔ مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر انکی زندگی میں "عصا خفتست"

کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا، مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے"

وُلے بجملہ اوّل عصا سے پیر بخفت"

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کیونکہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں، ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک یہ نہ جتایا جائے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لیے ہیں۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری	غالب
کجا زعشوۂ آں چشم نیم باز رھیم	وگرز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پاے ما خفتست	مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اس حالت کو۔ جبکہ وہ سوتے سے اُٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور ہمارا پانوں سو گیا ہے پس اُس کی چشم نیم باز کے عشوے سے کیونکر رہائی ہوگی۔

مرزا مسافر کی اُس حسرت ناک حالت کو جبکہ راہ بیخطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر نہ مسافر میں نہ اُسکی سواری میں آگے قدم اُٹھانے کی طاقت ہو۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "وگرز ایمنی راہ الخ۔ ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دیجا سکتی جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کرینگے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے اسکا مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے

نظیری	غالب
کسی بہ قلب شبم ترکتاز می آرد	غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق
کہ بر فراش قصب پائے در حنا خفتست	عسس بخانہ وشہ در حرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اوّل اسکو سوجھا ہے مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا ڈالتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسکا تصور اور اُسکا خیال بغیر اسکے کہ اسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محلسرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر ذاکی غیر معمولی اُپج اور بلند پروازی کے ثبوت کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری	غالب
شمیم مہر ز باغ وفا نمی آید	ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را
بہر چمن کہ تو بشگفتۂ صبا خفتست	دریچہ باز و بدر وازہ اژدہا خفتست

اگرچہ مآل دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوق حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں

کی صبا پڑی سوتی ہے۔ یعنی اُسکو امتیاز مطلق نہیں ہے۔ جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اُسکو دور ہی سے دیکھ لو، اور قرب شاہ۔ یعنی ذات بحت کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اسکے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیونکہ عین دروازے پر اژدہا سوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری	غالب
طبیب عشق ببرد طمع ز بیمارے	بصبح حشر چنیں خستہ روسیہ خیزد
کہ شب براحت ازیں درد بے دوا خفتست	کہ در شکایت درد و غم دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرض عشق کا طبیب اس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی رات کو اس درد بے دوا یعنی عشق کی بیچینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو، گویا مریض عشق کی علامت محمود یہی ہے کہ اسکو کبھی راحت نصیب نہ ہو۔ مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے، حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اُسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ بیچینی اور بیقراری میں بسر کرے، اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اسکی زبان سے نکلے گی۔ مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن روسیاہ

اُٹھے جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری	غالب
کس از معانقۂ روزِ وصل باید ذوق	درازیِ شبِ وبیداریِ من انیمہ نیست
کہ چند شب زہم آغوش خود جدا خفتست	زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس آں کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقۂ روزِ وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈالدی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شبِ ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں ہے ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیونکہ رات کی درازی، اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اُسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حال ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اُس میں اُن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	غالب
شبِ امید بہ از روزِ عید می گزرد	بدیں نیاز کہ بالینتِ ناز می رسدم
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اُسکی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اسکے سارے دیوان کے اُن ۲، نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اُسکی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دلنشیں واقع ہوئی ہے۔

یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو جو تیرے جناب میں نیاز ہے اُس پر مجھکو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سایے میں پڑا ہو۔

نظیری	غالب
فسانہ صرف نظیری مکن کہ خواب کند	بخواب چوں خودم آسودہ دل بداں غالب
شکستہ کہ بصد درد مبتلا خفتست	کہ خستہ غرق بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے۔ وہ سو رہیگا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھکو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیونکہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہو۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں لکھتے ہیں۔

خروش حلقۂ زندان نازنین پسریست — کہ سر بہ زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز — گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست
دلم بسبحہ و سجادہ رہا نکرد — کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ خفتن من ہر کہ بنگرد داند — کہ میر قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی

لطافت نہیں رکھتا اسکے بعد کے تینوں شعر ہم نے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعر بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں ورنہ انصاف یہی ہے کہ ہیئت مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں

صائب چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچشمی نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں

درے از نزہتگاہ معنی بروے کشودہ اند

بس ہماری غرض مذکورۂ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی اُنھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو ان کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے

بچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی غزل پر لکھی گئی ہیں۔

شب فراق چہ داند کہ تا سحر چند است مگر کسیکہ بہ زندان عشق در بندست

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متتبع ظاہر کرتے ہیں اسلئے اُسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جس کے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیے گئے ہیں اور اسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لیے وہی غزل موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ اور ایک وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

ظہوری	غالب
بعشق قابل دیوانگی خرد مندست	چو صبح من زسیاہی بشام مانندست
ببر ز جملہ کہ آزاد۔ مزایں بندست	چگویم کہ زشب چند رفت یا چندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند

سمجھنا چاہیے۔ پس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کردے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بند عشق کا مرد (یعنی اسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھ سے یہ کیا پوچھتے ہو رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے۔ ظہوری کے شعر میں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری	غالب
بشکر دیدۂ تر زبانیئے دارم	نگاہ مہر بہ دل سرنداد چشمۂ نوش
کہ زہر گریہ۔ طراوت دہ شکر خندست	ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریے کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اُسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر۔ کوئی دلی محبت کی بات ابتک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اسکی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی بلکہ ہم صرف اسکے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہر گریہ

اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلینڈ نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

ظہوری	غالب
مگر کہ رخصت بے طاقتی شود مرہم	نہ گفتۂ کہ بہ تلخی بساز پند پذیر
کہ گوش دل شدگاں ریش گشتہ پندست	برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پندست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے انکے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ انکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دیجائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کیا؟ کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کرلے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے تازہ تلخ ہے، پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل داردت کشاکش را	دراز دستی من چاکی ار فگند چہ عیب!
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوندست	زپیش۔ دلق درع باہزار پیوندست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کرالی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں، کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوند عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بیباکی و رندمشربی نے دلق و رع و تقوی کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہل درع و تقوی ہی اسکی دھجیاں اڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعت تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا کہ سیختن پر اسکے ضد حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے یہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم داد بلاغت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُس پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

ظہوری	غالب
بگو حدیث وفا از لبِ تو با درست بگو	ز بیم آنکہ مبادا بمیرد از شادی
شوم فدای دروغی کہ راست مانندست	نہ گوید ار چہ بمرگ من آرزومندست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے یہاں آرزومند کا قافیہ کہیں اور نہیں بندھا۔ اسلیے یہ دونوں مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدی گئی ہیں۔ معنی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر یہ سنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری	غالب
ز اہل مہر و محبت نشاں ندارم کس	وجود او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق

بہ مہر خویش و بہ بیمہری تو سوگند ست پہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں، اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بیمہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔

مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے، اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے۔ اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے۔ جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلیے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اسلیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اسکے سودا میں عشق و محبت کا پُتلا بن گیا ہے اسکے سوا لفظی مناسبتیں۔ جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری	غالب
زرہروان تو منزل شمار را کہ شمرد	شمار کجروی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نہد اندہش چندست	دریں نورد ندانم کہ آسماں چندست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اسکو تیرے رہروؤں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسے ست" یعنی غم معشوق اس شخص کا حصّہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ

مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
شود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست	بہ رنج از پئے راحت نگاہداشتہ اند
اسیر آنکہ بہ تار نگاہ در بند ست	زحکمت است کہ پای شکستہ در بند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو نگاہِ معشوق میں الجھا ہوا ہے۔ جسکو قید سے کبھی رہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اسلیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اسکی مثال یہ ہے کہ پاشکستہ آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
زبندگان نسنزد آرزو۔ خدا نہ کند	اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار
ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوندست	کہ بندہ خوبی او خوبی خداوندست

ظہوری کے شعر میں "خدا نہ کند" یا تو محض حشو ہے، اور اسکے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نہ کند کو ما آرزو بکنیم"، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معنیً اور لفظاً دونوں

طرح ظہوری کے غمزہ پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیر عشق ظہوری نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ بہ بیداد دوست خرسند ست	بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔

مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا سے وفا کا طالب ہوں بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور وہ لوگ اسکے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے دونوں مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح تخ بی کر دی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے۔ اس بات کا اندازہ کرلیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیات تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بیباکی، بادہ خواری، فخر و مباہات، اور شکایت روزگار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت

عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے چنانچہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کر دیجائیگی۔

غالب یہ گہر ز دودۂ زادِ شمم (۱) زاں رو بصفائی دم تیغ ست دمم
چو رفت سپہیدی زدمِ جنگ بشنگ (افخریہ) شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر و گوہر۔ اصل دودہ۔ نسل و خاندان زادِ شمم۔ بشنگ کے باپ اور توران فریدوں کے بیٹے کا نام ہے جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دمِ تیغ، تلوار کی دھار۔ دمم یعنی میرا کلام۔ سپہیدی، سلطنت و سپہ سالاری نیا، دادا۔ نیاگاں جمع۔ کہتا ہے جب سپہیدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کر لیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

شرط ست کہ بہر ضبطِ آداب و رسوم (۲) خیزد بعد از نبی امامِ معصوم
ز اجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے (تفضیلیہ) کہ جائے نشین مہر باشد۔ نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر۔ کیونکہ خلفائے ثلثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کر سکتے۔

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ (۳) خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانہا دارد (النص) سر چشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندہ سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے، خواہ اسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبیٰ ہیں جن میں اُسکی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے اثنائے راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے

آن مرد کہ زن گرفت دانا نہ بود (۴) از غصہ فراغتش ہمانا نہ بود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو (شوخی) نازم بخدا چرا تو انا نہ بود

تیسرے مصرعے میں دارد کا فاعل خدا ہے جسکا نام چوتھے مصرعے میں لیا ہے
خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

بادست غم۔ آں بادکہ حاصل ببرد (۵) آب رُخ ہوشمند و غافل ببرد
(شوخی) بگذاشتہ ام بخمے ز صہبا بہ پسر کُشتہ اندوہ مرگِ پدر ار دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے، اور دانا اور نادان کی آبرو کو بہا لیجائے، اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اسکے دل سے دُھووے۔

اے آنکہ براہِ کعبہ روے داری (۶) نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
(شوخی) زیں گونہ کہ تندمی خرامی۔ دانم درخانہ زن ستیزہ خوے داری

کہنے جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بدمزاج عورت ہے جسکے سبب سے کہنے جانے میں اسقدر جلدی ہے۔

شاہا ہر چند وا بہ جو آمدہ ام (۷) دانی کہ چہ مایہ نغز گو آمدہ ام
(فخریہ) رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام آنم کہ محیط را بجو آمدہ ام

زانجا کہ دلم بو ہم در بند نبود (۸) باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
(تعلقی) مقصودِ من از کعبہ و آہنگ سفر جز ترکِ دیار زن و فرزند نبود

یعنی چونکہ میں وہم میں۔ جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے گرفتار نہ تھا، اسی لیے کعبے کے عزمِ سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اے جامِ شراب شاد کامی زدۂ (۹) در جو روم از بلند نامی زدۂ
(عاشقانہ) یاد آر زمن چو بینی اندر راہے تنہا رو خستۂ حرامی زدۂ

حرامی، قزاق۔ حرامی زدہ، قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے۔ اور اپنی حالت کو اس مسافر سے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا۔

(۱۰) منعم مکن از بادہ کہ نقصان من ست — اے آنکہ ترا سعی بدرمان من ست
(شوخی) ایں یک دو سہ خم کہ شبستان من ست — حیف ست کہ بعد من بمیراث رود

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں مرگیا تو غضب ہو جائیگا کہ یہ اکٹھے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئیں گے میرے وارثوں کو پہنچ جائینگے۔

(۱۱) ریزد ہمہ درد و درد و تلخ آبہ زہر — آنم کہ بہ پیمانہ من ساقی دہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا — سعد و نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں کے ستارے نحس ہو گئے کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے

(۱۲) خونابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر — شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر
مومن چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر — کافر باشم اگر بمرگ

(۱۳) رفتارِ اسیران رہ وزاد جدا ست — غالب روشِ مردمِ آزاد جدا ست
(ترکمان) واں باغچہ ضبطی شداد جدا ست — ماترک مراد را ارم مے دانیم

یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں انکا اور ڈھنگ ہے ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام ارم ہے، اور وہ ارم جس سے شداد محروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

این نامہ کہ راحتِ دل ریش آورد ۔۔۔ سرمایۂ آبروے درویش آورد
در ہر بن مو دمید جانے یعنی ۔۔۔ سامانِ نثار خویش با خویش آورد
منصور غمش زنکتہ چنیاں چہ بود (۱۵) ۔۔۔ در راست خطرز ہمنشیناں چہ بود
چوں عاقبتِ یگانہ بیناں دارست (اقتضٰ) ۔۔۔ دریاب کہ انجام و و بینیاں چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بین لوگوں کا انجام دار ہے تو دور بینوں کا انجام کیا ہونیوالا ہے۔

ہر کس زحقیقت خبرے داشتہ است (۱۶) ۔۔۔ بر خاکِ رہ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بہ دعوے طلبید (شوخی) ۔۔۔ شداد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اسکو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا، کیونکہ اول تو ارم جو کہ منزو کہ شداد ہے اسکا دعویٰ کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اسکے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست (۱۷) ۔۔۔ از نشئہ ہوش بیخ اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و لغز انگبہ بسیار!!! (شوخی) ۔۔۔ ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، گو عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں ہے، شراب چاہتا ہے، وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کشت سے!!! یہ بادہ فروش ہے ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔

گردیدن زاہداں بجنت گستاخ (۱۸) دیں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی زروے تشبیہ (شوخی) ماند بہ بہائم وعلف زار فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بیباک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لئے ہاتھ مارنا، اگر غور کرکے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور ڈنگر چرتے پھرتے ہیں۔

آنراکہ بود در سرے در فرجام (۱۹) ہم محرم خاص آید وہم مرجع عام
آساں نہ بود کشاکش پاس قبول (اخلاق) زنہار نہ کردی بہ نکوئی بدنام

فرجام۔ انجام، اور نکوئی انجام اور رونق کو بھی کہتے ہیں یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے نہایت سخت چیز ہے پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور ہونا نہیں چاہیے اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑگئی ہے۔

در عالم بے زری کہ تلخست حیات (۲۰) طاعت نہ تواں کرد بہ امید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم وصلوٰۃ (شوخی) بودے بوجودِ مال چوں حج وزکوٰۃ

کہتا ہے کہ بیمقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی امید پر طاعت نہیں ہوسکتی کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے روزے اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

ہرچند زمانہ مجمع جہّال ست (۲۱) در جہل نہ حال شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ۔ لیک از یکے تا دِگرے فرق خرِ عیسیٰ و خرِ دجّال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جھڑان جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں انکا حال متفاوت و مختلف ہے کودن تو سب ہیں مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خر عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم (۲۲) شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست (میکش و جوہر) در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم۔ یعنی پیرِ مغاں باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

دستم بہ کلید مخزنے بایست (۲۳) وربود تہی۔ بدامنے می بایست
با ہیچ کسم بہ کس نیفتاد بے کار (مخزن) یا خود بزمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو اُس میں کسی کا دامن ہونا چاہیے تھا۔ جسکے توسل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا۔ جو میری قدر کرتا۔

ہستم زمے امید سرمست۔ وبس ست (۲۴) دارم سرایں کلاوہ در دست وبس ست
گر ارزشِ لطف و کرمے نیست مباش! (امید فضل) استحقاق ترحمے ہست وبس ست

سرایں کلاوہ۔ یعنی سرایں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

گر گردِ زر گنجِ گہرے برخیزد (۲۵) مپسند کہ دو دو از جگرے برخیزد
منت نہ تواں نہاد بر گدیہ گراں (اخطاب بہ ضنا) بنشیں کہ بخدمتِ دگرے برخیزد

گنج گہر سے گرد اُٹھنے کے معنی اسکے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہر کا خزانہ خالی ہو جائے تو بلا سے مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دھواں

اُٹھے، بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا۔ خدا نے انکی خدمت پر تجھکو کھڑا کیا ہے اگر تجھ سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لیے اُٹھے۔

اے دوست بسوی ایں فرو ماندہ بیا (۲۶) از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام (عاشقانہ) بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں اسکے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تو نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مت بُلانا میں تیری موت ہوں اچھا اب تو اپنے کہنے پر قایم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد (۲۷) صاف مے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہر اسم الٰہی کہ بود آغاز زابتدا ے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیخاں مرحوم کو مرزا نے خط لکھا تھا اسکے اوّل میں لکھی تھی معنی ظاہر ہیں۔

بازی خورِ روزگار بودم ہمہ عمر (۲۸) از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا (امید بجا) بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

باید کہ دلت زغصہ برہم نہ شود (۲۹) از رفتن زر دست خوش غم نہ شود
ایں سیم و زر ست خواجہ ایں سیم و زر ست! (خطاب بہ ضیا) غم نیست کہ ہر چند خوری کم نہ شود

دست خوش مغلوب و زبردست۔ کہتا ہے کہ اے دولتمند! چاہیے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا نہ رہے۔ اے حضرت یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے یہ غم نہیں ہے کہ جسقدر کھائے جایئے کم نہیں ہوتا۔

دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے (۳۰) (دُرِ لالۂ گوش) وز کرّی گوشم نہ بود پروائے

خوب ست کہ نشنوم زہر حود زائے گلبانگِ اَنا ربکم الا علائے

کہتا ہے کہ مجھکو کڑی گوش یعنی ثقل سماعت کی کچھ پرواہ نہیں، بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے اَنا ربکم الا علیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

اے کردہ بآرائش گفتار پسیچ (۳۱) در زلفِ سخن کشودہ راہ خم و پیچ

عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی (توحید وجودی) ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

پسیچ۔ قصد۔ زلف سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی کہتا ہے کہ عالم جسکو تو نے کچھ چیز سمجھ رکھا ہے وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بس اسکے سوا کچھ نہیں۔

اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من (۳۲) ہر خاک کہ باتست ہمہ برسرِ من

زر بہر کسان و بہر من دانۂ و دام!! (شکایت) اے مادرِ دیگران و مادندرِ من

مادندر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری مینڈرہے۔ یہ مضمون تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے رودکی کہتا ہے۔

جہانا چہ بینی تو از بچگاں کہ مادر گہے گاہ مادندری

اور فرخی کہتا ہے۔

مہر فرزندی برخواجہ فگندہ ست جہاں ایں جہاں مادرِ او نیست کہ مادندِ اوست

آنرا کہ زدست بے زری پامال ست (رسوائی) رسوائی نیز لازمِ احوال ست

ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے ساقی نگرش پیالہ از غرباں ست

کہتا ہے مفلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہمکو دیکھو! کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جاکر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت ملجاتی ہے تو بدمست ہوکر اُسکی دوکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، آنے جانے والے سب اُسکو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں حالانکہ کبھی اسکو اطمینان سے سیر ہوکر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہمکو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شرابور ہو جاتے ہیں ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں

اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس (۲۴) زنہار مشوز رحمت حق مایوس

ہشدار! کہ آتش جہنم حق را تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

فسوس۔ ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اُسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اسی طرح آتش جہنم سے نفوس انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

یارب تو کجائی کہ بہ مازر نہ دہی (۲۵) (شوخی) بیدرد خدائی کہ بہ مازر نہ دہی

لنے لنے تو نہ غائبی، و لنے بیرحمی بے مایہ چو مائی کہ بہ مازر نہ دہی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوشحالی و بدحالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہم نے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہوگئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگدستی ہمکو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہوگیا ہے جو ہمکو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں اس قسم کے خطابات آداب شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے۔

مابروں رانگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

قصائد مرزا کے قصائد۔ جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے ان کے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت اُستاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جسمیں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور خاص پسند ہونا۔ بہت کم پایا جاتا ہے بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان وظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا، اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستایش سے زیادہ پھیکا سیٹھا ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا، علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی لے کو بڑھا بڑھا کے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے اور اس کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے معرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور اُنکے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجایش نہیں ہے اسلیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

اے زوہم غیر غوغا در جہان انداختہ　　گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پروانگے — پردۂ رسم پرستش درمیاں انداختہ
نقش بر خاتم زحرفِ بے صدا انگیختہ — شور در عالم زحسنِ بے نشاں انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع دَرَوا[1] ریختہ — خاک را بر قطع[2] پیدائی ستاں[3] انداختہ
عاشقاں در موقفِ دار و رسن واداشتہ — غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ
رنگہا در طبعِ ارباب قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہل بیاں انداختہ
باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مردہ را از خویش دریا برکراں انداختہ

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مردے کو باہر پھینکدیتا ہے اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نرد بانے بستہ با دیوار کاخے در نظر — انتقا[4] شے در نہادِ این و آن انداختہ
رفتہ ہر کس تا قدِ مکاہے وزانجا خویش را — پایہ پایہ از فرازِ نردبان انداختہ
غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد — بہر آسانی اساسِ آسماں انداختہ
گل چو ماند دیر گردد بردلش[5] بازار سرد — بہر تجدید طرب طرحِ خزاں انداختہ
آتشے از روے گلہاے بہار افروختہ — شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ
دجلۂ در ساغرِ معنی طرازاں ریختہ — رشحۂ در کاسۂ دریا وکاں انداختہ
جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد — کعبہ را جوے بہشت از ناوداں انداختہ
جز بدیں الماس نتواں انجمن را دانہ سفت — رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اسلیئے میزاب کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیشِ مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اسکا بیندھنا یعنی اس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

---

[1] معلق ۱۲ [2] فرش ۱۲ [3] ۱۲ [4] چاؤ ۱۲ [5] یعنے بازارش بروں سرد گردد ۱۲

چشم را[1] بخشیده چوناں گردشے کاز باہوش
بر زمیں دانند طرح آسماں انداختہ

دادہ ابرو را بدانساں جنبشے کاہل قیاس
در تنِ شمشیر پندارند جاں انداختہ

ای ز شرمِ خاکسارانِ تو - از شہپر - ہما
چوں گلیم کہنہ ظل را بر کراں انداختہ

ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو گنجِ شاہ را
از دلِ گنجور و چشمِ پاسباں انداختہ

تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود
دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ

تا علاجِ خستگی آسائش دیگر دہد
خارہا در رہگذارِ میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

کفر ست کفر - در پے روزی شتافتن
ننگ ست ننگ - در غمِ دنیا گریستن

گاہے بداغِ شاہد و ساقی گداختن
گاہے بمرگِ مانک و بابا گریستن

باید بدردِ دہر زہ گرستن و گر گریست
بیجا گریستیم - دریغا گریستن

رشکم آید م بہ ابر کہ در حدِ وسعِ اوست
بر خاکِ کربلائے معلّےٰ گریستن

رفت آنچہ رفت - باید م اکنوں نگاہداشت
از بہرِ نورِ دیدۂ زہرا گریستن

باراں رحمتے!!! کہ بانداز شستِ[2] وشو
دارد بہ روسیاہیِ اعدا گریستن

خود را ندیدزاں لبِ نوشیں بکامِ خویش
زیبد بہ شورِ بختیِ دریا گریستن

مژدِ شفاعت و صلۂ صبر و خونبہا
ہیچ از کسے نخواستہ الّا گریستن

چوں رزقِ غیب در دلِ تر اعام کردہ اند
سرمی زند ز مومنِ و ترسا گریستن

(نوحہ)

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ
داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ

اے بمہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت
از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفےٰ

سایہ از سروِ روانِ مصطفےٰ افتد بخاک
ہاں چہ بر خاک افگنی سروِ روانِ مصطفےٰ

گرمیِ بازارِ امکاں خود طفیلِ مصطفےٰ است
بیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ

---

[1] یعنی چشمِ معشوقاں ۔ [2] یعنی شست و شوی ۱۲

کینہ خواہی[1] بیں!! کہ با اولادِ سجادش کنی — آنچہ با مہ کردہ اعجاز بنان مصطفیٰ
نیک نبود کز تو بر فرزند دلبندش رود — آنچہ رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفیٰ
با تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنج حسینؑ؟ — یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفیٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفیٰ را با حسین؟ — یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ
آں حسینؑ ست اینکہ گفتی مصطفیٰ روحی فداک — چوں گرشتی نام پاکش بر زبانِ مصطفیٰ
آں حسین ست اینکہ سودے مصطفیٰ چشمش[2] بخ — بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفیٰ
قدسیاں را نطق من آوردہ غالبؔ در سماع — گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفیٰ

نوحہ

اے کج اندیشہ فلک حرمت دیں بایستے — علمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند — عزتِ شاہ شہیداں بہ ازیں بایستے
حیف باشد کہ فتد خستہ زتوسن بر خاک — آنکہ جولانگہِ او عرشِ بریں بایستے
حیف باشد کہ زا عدادِ[3] اَبے طلبد — آنکہ سائل بدرش روح امیں بایستے
تا زیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع — وطنِ اصلی ایں قوم زچیں بایستے
ایہا القوم! تنزل بود ار خود گویم — میہماں بے خطر از خنجر کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جاے کہ اہل شام کربلا کا میہماں خنجر کیں سے محفوظ رہنا چاہیے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لایق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن انیست کہ در راہِ حسینؑ ابن علیؑ — پو بہ از روی عقیدت بہ جبیں بایستے
چشم بد دور - بہ ہنگام تماشاے رخش[4] — رونما سلطنتِ روی زمیں بایستے
دشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن[5] — اگرش ملک گر تاج و نگیں بایستے

---

[1] انتقام کسی ۱۲ [2] یعنی چشم بر رخش ۱۲ [3] آبے ۱۲ [4] دادن داشت یعنے می بایست داد ۱۲

چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و نغیض
آں نکردید کہ از صدق و یقیں بایستے

با اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتلِ حسینؑ
دل نرم و منش مہر گزیں بایستے

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالبؔ
عَلَمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

(نوحہ)

وقت ست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی
سوزد نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی

وقت ست کہ آں پردگیاں۔ کزرہِ تعظیم
بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند
چوں شعلہ دخاں بر سرشاں کردہ روائی

جانہا ہمہ فرسودۂ تشویشِ اسیری
دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی

اے چرخ چواں شد گر از بہر چہ گردی
اے خاک چوایں شد دگر آسودہ چرائی

خوں گرد۔ فروریز!! اگر صاحب مہری
برخیز و بخوں غلط! اگر از اہل وفائی

تنہا ست حسین ابن علی در صفِ اعدا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی

تو قیعِ شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت
از خونِ حسین ابن علی یافت روائی

فریاد ازاں حاملِ منشورِ امامت
فریاد ازاں نسخۂ اسرارِ خدائی

فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی
فریاد ازاں زاری و بیرگ و نوائی

فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی
فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی

غالبؔ جگرے خوں کن و از دیدہ فروبار
گر روے شناسی غمِ شاہِ شہدائی

(نوحہ)

سروِ چمنِ سروری افتاد ز پا۔ ہائے
شہ غرقہ بخوں پیکرِ شاہِ شہدا ہائے

بر خاکِ رہ افتادہ تنے ہست۔ سرش کو
آں روی فروزندہ و آں لعلِ دوتا ہائے

عباسؑ دلاور کہ دراں راہروی داشت
شمشیر بکف دست و بکف دست لوا ہائے

آں قاسمِ گلگوں کفنِ عرصۂ محشر
واں اکبرِ خونیں تنِ میدانِ وغا ہائے

آں اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز — واں عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا ہائے
اے قوتِ بازوئے جگر گوشۂ زہرا — دستِ تو بشمشیر شد از شانہ جدا ہائے
اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری — کافور کفن۔ بگذرم از عطر و قبا ہائے
اے مظہرِ انوار کہ بود اہلِ نظر را — دیدار تو دیدارِ شہِ ہر دوسرا ہائے
اے گلبنِ نورستۂ گلزارِ سیادت — نایافتہ در باغِ جہاں نشو و نما ہائے
اے منبعِ آں ہست کہ آرائشِ خلد ند — داغم کہ رسن شد بگلوئے تو روا ہائے
بالغ نظرانِ روشِ دینِ نبی حیف — قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا ہائے
ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں حیف — غارت زدۂ آں قافلۂ آلِ عبا ہائے
آں تابشِ خورشید دراں گرمِ روی حیف — واں طعنۂ کفار دراں شورِ عزا ہائے
غالبؔ بملائک نتواں گشت ہم آواز — اندازۂ آں کو کہ شوم نوحہ سرا ہائے

از قصیدہ ضریحیہ

بیادر کربلا تا آں تمکش کارواں بینی — کہ در روئے آدم آلِ عبا را سارباں بینی
نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را — مگر در خارِ بن[1] ہا تار و پودِ طیلساں[2] بینی
ہما ناسیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریباں را — کہ ہر جا پارۂ از رختِ موجے از دخاں بینی
بہ بینی چشمۂ از آب و چوں جوئی کنارش را — زخونِ تشنہ کاماں چشمۂ دیگر رواں بینی
بہ بینی سر خوشِ خوابِ عدم عباس غازی را — نہ مشکش در خمِ بازو نہ تیرش در کماں بینی
ہجومِ خستگان و سوزِ دسازِ نوگرفتاراں — تو آئیں بزمِ طوئے قاسمِ ناشادماں بینی
نمی بینی کہ چوں جاں دادِ از بیدادِ خواہاں — علی اکبر کہ ہمچوں کعبہ بدخواہش جواں بینی
گر ستم کاینہمہ بینی دلے داری و چشمے ہم — بخوں آغشتہ نازک پیکرِ اصغر چساں بینی
چہ دنداں در جگر افسردہ باشی کاندراں وادی — حسین ابن علی را در شمار کشتگاں بینی

---

[1] خار بن = خار مغیلان
[2] طیلسان = چادر

نیاری گردراں کوشی کہ پائیش در رکاب آری
نہ بینی گر خود آں خواہی کہ دستش بر عناں بینی

تنے را کش رگِ گل خار بودے بر زمیں یابی
سرے را کش زِ افسر عار بودے بر سناں بینی

ستایشِ روزگار

ہست از تمیز گر بہما استخواں دہد
آئین دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردست مرد ہر چہ کند بے خطر کند
راد ست[۵] راد ہر چہ دہد رایگاں[۵] دہد

گلزار را اگر نہ خمِ گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر
وانگہ کلیدِ گنج بدست زباں دہد

تا روزِ خاک تیرہ نہ گردد ز رشکِ چرخ
رخشانیِ ستارہ بریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نہ گیرد ز یک ہوا
سرماؤ نوبہار و تموز و خزاں دہد

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن
تا راحتِ مشام و نشاطِ روان دہد

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق
تا آرزوے کام و مرادِ دہان دہد

آں را کہ بخت دستِ رس بذلِ مال نیست
طبعِ سخن رس خردِ خردہ داں دہد

آں را کہ طالع کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد

دائم کہ آسماں بہ زمیں پیشکار کیست
عکسِ چہ جلوہ روشنی روشناں[۵] دہد

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور ست
بیدادنہ بود اینچہ بما آسماں دہد

رنگ از گل ست و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ
ہر جا بہار ہر چہ بود در خور آں دہد

در نشترِ نفجہ قرعہ بنامِ ہوا زند
در نشتو سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد

مستیز با نسیم اگر بلبلے بہ باغ
جاں در نوردِ خار و خسِ آشیاں دہد

دار و ز بہرِ زندگی آمد نہ بہرِ مرگ
جرمِ پزشک[۵] چیست اگر خستہ جاں دہد

---

۵ فیاض ۱۲۔ ۵ مفت ۱۲۔ ۵ ستارگاں ۱۲۔ ۵ طبیب ۱۲

پرویز دیر یاب شہے بود ورنہ بخت — آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد
فرہاد زود میر کسے بود ورنہ دہر — کام دل غریب پس از امتحاں دہد
دارم ز روزگار نویدے کہ آں نوید — در پیریم بشارت بخت جواں دہد
از داور[1] زمانہ باندیشہ درست — شادم کہ مزد بندگیم ناگہاں دہد
ہر کہ بسر نوشت سر آید شمار غم — راہم بہ بارگاہ شہ انس و جاں دہد
سلطان دیں محمد مہدی کہ رائے او — منشور روشنی بہ شہ خاوراں دہد

صفت سالکان طریقت

(تشبیب قصیدہ حج بہادر خاوہ مرحوم)

رہروان[2] چوں گہر آبلۂ پا بینند — پائے را پایہ فراتر ز ثریا[3] بینند
ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش[4] دارند — ہر چہ در سینہ نہانست زسیما بینند
راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند — نقش کج بر ورق صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ "لیس فی الامکان ابدع مما کان" یعنی جو نظام عالم کہ اب موجود ہے اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینان ازل کوری چشم[5] بدمن — ہم دریں جا نگرند انچہ در آنجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جوے کہ از دیدہ دری — نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی — جادہ چوں نبض تپاں در رگ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست — زخمہ گر دار بتار رگ خارا بینند
قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست[6] — صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند — روز در منظر خفاش ہویدا بینند
وحشت تفرقہ در کاخ مصور سنجید — مجمع انس بہ لے بست زلیخا بینند

---

[1] مراد از داور زمانہ خود زمانہ ۱۲ [2] سالکان ۱۲ [3] بالاتر ۱۲ [4] بنظر غور ببینند ۱۲ [5] یعنی چشم بد دور ۱۲ [6] یعنی گرہ بشد ۱۲

کاخ مصور وہ محل جسکو زلیخا نے وصال یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش وکامرانی جمع تھا۔ نے بست وہ جھوپڑا جو یوسفؑ کے قید ہوجانے پر انکی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخ مصور جیسے آراستہ محل میں اس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسفؑ اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخر کار پیدا ہوا اور اُنس اور ملاپ کو اُس نے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کو اسکے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہرچہ گویدعجم از خسرو وشیریں شنوند ہرچہ آرد عرب از وامق وعذرا بینند

یعنی خسرو وشیریں کا قصہ جو اہل عجم بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ہیں اور وامق وعذرا کی روئداد جو عرب والے بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود وامق وعذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند نخزوشند اگر محمل لیلےٰ بینند

خوں خورند وجگر از غصہ بدنداں گیرند خویش راچون بسر مائدہ تنہا بینند

یعنی جب انکے ساتھ کوئی دوسرا دسترخواں پر نہیں ہوتا تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض انکو پہنچتا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سرو تن راگر از در دستوہ انگارند جان ودل راگر از دوست شکیبا بینند

قطرۂ آب بلب بوسۂ نشتر شمرند پارۂ نان بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونوں شعر دست وگریبان ہیں مطلب یہ ہے کہ در دطلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہند وخوانند بادہ راشمع طرب خانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب وموزوں خیال کرتے ہیں اور

کسی چیز سے از راہِ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلےٰ بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرع میں شعائر اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلّی وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں و ریا و رنگ ہر چہ بینند بہ عنواں تماشا بینند

جام جویند و زرندی نہ گزایند بہ زہد سبحۂ انجم اگر دید بیضا بینند

ہر چہ در شوہ نہ تواں یافت بہ ہر سو یابند ہر چہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

ہمہ گردند دراں پایہ کہ اور ادانند ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

ایں نظر ہائے گرانمایہ فراموش کنند چوں بہ نیرنگ سخن شعبدۂ ما بینند

(اشعار فخریہ) نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

گر پے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند گر پے فال بصد رنگ تمنا بینند

بر دازیاد کہ دنیاست نمود بے بود ایں دل افروز نمود یکہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی و جدانی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی تو وہ انکے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کر دے گی کہ دنیا محض ایک نمود بے بود ہے۔

صفت موسم بہار

(تشبیب قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ)

شکر کہ آشوب برف و باد سر آمد نامیہ از بند زمہریر بر آمد

لہ جہت ۱۲ عہ مکان ۴ عہ یعنی ایں ملاحظات کہ بالا مذکور شد ۱۲

کسب ہوا نفع آب[۵۱] خضر رساند سبزہ جہاں راہ بیشہ را ہبر آمد

یعنی آجکل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آب حیات کے پینے سے ہوتا ہے۔ اور جس طرح خضر آبحیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

درچمنستاں کشودہ بار نوا در[۵۲] باد کہ باز رگاں[۵۳] بجرو بر آمد

انتظار[۵۴] گل بود ارنہ[۵۵] دیدہ نرگس زحدقہ چوں[۵۶] بدر آمد

تازچہ دانستہ قرب مقدم گل را سبزہ بہ باغ از شگوفہ پیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے باغ میں آیا ہے اس نے گل کی آمد آمد کہاں سے سن لی۔

بہندہ[۵۷] نبود خروش مرغ سحر خواں کو کبۂ گل[۵۸] مگر بباغ در آمد

قیس کبا تا کند شمارہ محمل از بس ہر غنچہ غنچہ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گل کو لیلیٰ سے تشبیہ دی ہے کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا نہیں جانتا وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیونکہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا دھم جبرا نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرت انواع گل نگر کہ ہیولے[۵۹] رنجہ زبار فزونی صور آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدرت کثرت ہے کہ ہیولی بیشمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیجد ز تیغ کوہ گذشتن دامنش اینک ززیر سنگ بر آمد

بسیجد یعنی ارادہ کرتا ہے۔ تیغ کوہ قلۂ کوہ۔ دامن از زیر سنگ بر آمدن مصیبت سے نجات پانا۔

---

[۵۱] بہ نیوال ۱۲ [۵۲] نقاش ۱۲ [۵۳] سوداگر ۱۲ [۵۴] شدت ۱۲ [۵۵] ورنہ ۱۲ [۵۶] چرا ۱۲ [۵۷] یعنی ہیوجہ ۱۲ [۵۸] سواری [۵۹] شاید ۱۲

نگہت گل شد و بائے عام جعل را　　زنجرہ ہر شب نہ ہزم مویہ گر آمد

جعل ایک جانور ہے سیاہ رنگ جسکو خوشبو راس نہیں اسی لیے موسم بہار میں مرجاتا ہے اور چونکہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے اس لیے اسکو ہندی میں گبریلا کہتے ہیں۔ زنجرہ جھینگر ہو رات کو اکثر بولتا ہے۔ مویہ گزنالاں وگریاں۔

میکدۂ خسر و گل ست۔ رزستاں　　صورت مینا زغورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسرو گل کا شراب خانہ ہے کیونکہ اس میں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے شراب کی بوتلیں

رو نم تر دامنی نخور کہ جہاں را　　موج گل از ہر کرانہ تا کمر آمد

فتوی مے داد ابر و باد و لیکن　　شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بدگہر آمد

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا

در روزگار ہا نہ تواند شمار یافت　　خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

پرکار تیز کرد فلک در میاں مبیں　　حق داد داد حق کہ بجز کز قرار یافت

درہائے آسماں بہ زمیں باز کردہ اند　　ہر کس ہر انچہ جست بہ ہر روزگار یافت

آمد اگر بفرض زبالا بلا فرود　　بر روی خاک پیچ و خم زلف یار یافت

چوں حسن ماہ یک شبہ مینی۔ بداں کہ ماہ　　پاداش جانگدازی شبہائے تار یافت

چوں رنگ روی گل نگری شاد شو کہ گل　　اجر جگر خراشی پیکان خار یافت

در خاک و باد آتش و آب آشتی فزود　　ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت

ناچار۔ جز بہ داد گرایش نہ می کند　　در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت

ہر کس بقدر فطرت خویش ارمغان گشت　　ہر شے بحسن جوہر خویش اشتہار یافت

گر خواجہ بندہ را خط آزادگی نبشت　　ہم بر در سرائے خودش بندہ وار یافت

در بندہ خود زخشم خط بندگی درید — توقیع خوش دلی زخداوندگار یافت
مہر روشنی و مہر فروزش زسر گرفت — لیل و نہار صورت لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد — ناہید ذوق ورزش مضراب و تار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد — اندیشہ گنجہای نہاں آشکار یافت
جام از شراب روشنی آفتاب داد — بزم از بساط تازگی نوبہار یافت
روئے سخن بمعانی بیگانہ کرد گل — بانگ قلم نشاط نوائے ہزار یافت
برہم زد قاعدہ ہائے کہن بہ دہر — ہر کس نشاط تازہ زہر گونہ کار یافت
فیض سحر بہ غالب پیمانہ کس رسید — ذوق صبوح عابد شب زندہ دار یافت
رہزن متاع خویش برابن السبیل ریخت — کودک رضائے لہو آموزگار یافت
گر زاہدست نیز زمن مے بجام برد — ور مجرمست نیز زشہ زینہار یافت
بافتنہ ہم مضائقہ در خرمی نرفت — خود رخت خوابش از رگ گل پود و تار یافت
دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روے — ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت
از انتظام شاہی و آئین سروری — سور و سرور دانش و داد اعتبار یافت
برخستگان ہند بہ بخشود از کرم — وکٹوریا کہ رونق از روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدم توجہ نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور در زمانۂ سختی و بے مائگی کہ بعد از فتح دہلی روزے چند روے دادہ بود۔

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل — دائم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل
دریا دیہ بر گور غریباں زچہ سوزد — آں شمع فروزاں کہ بود در خور محفل
زاں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود — صد حیف کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل

لہ یعنی چشم ۱۲ لہ مبدل ۱۲ لہ یعنی من لہ نواب یوسف علیخاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب بمصول علم (باقی بر صفحہ ۲۹۲)

افسانۂ غم گر بسرایم نہ بود عیب — باد و ست کہ پیوستہ ہمی بردغم از دل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن[۵] — چوں می ندہد داد ز فریاد چہ حاصل
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہ[۵] یا — وا گفت کہ ہاں شیوۂ عشاق فرو ہل
تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم رمزے[۵] — حاشا کہ حکایت کنم از لیلی[۵] و محمل
شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل او را — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل
من نالم ازاں دوست کہ در عالم انصاف — شایاں بود ش گویم اگر خسرو عادل
او خسرو خوباں بود و بندہ گدایش — او قلزم و عماں بود و من خس ساحل
خود ہر چہ سرودم ہمہ با اوست کزیں پیش — امید گہم بود بہ ہر وادی و منزل
یارب چہ شد اینک کہ نمیرد خبر از من — بربستہ برویم در ارسال رسائل
اے یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم — مشتاق جمال تو چہ دیوانہ چہ عاقل
تا نزد تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم — ماندن[۵] ز تو و شوار و رسیدن بہ تو مشکل
اے کاش بکوے تو چنیں روے نمودے — زینساں کہ ز فرو رفتہ مرا پائی در گل[۵]
چوں ست کہ گاہے نکنی روی بدیں سو — از چیست کہ ہرگز نہ دہی دایہ بسائل[۵]
گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بگیتی — حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری؟ از دور بفرما — تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل

(البقیہ نوٹ صفحہ ۹۱) کے لیے دل میں آئے تھے اسوقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدر الدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدہ میں اس زمانہ کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدہ پر نواب ممدوح نے حضور وپیہ ماہوار مرزا کے لیے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کے دم واپسیں تک برابر جاری رہا ۱۲

[۵] خاموش باش [۵] مخواری [۵] یعنی روائے سخن ۱۲ [۵]

[۵] چونکہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اسلیئے کہتا ہے۔ میں اس تشبیب میں لیلیٰ و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روے سخن نہیں ہے ۱۲

[۵] یعنے ارتقای تو و ماندن ۱۲ [۵] یعنے در وطن خود ۱۲ [۵] دریوزہ ۱۲

از منعمِ استادِ ازل داں کہ زبر سوے — چوں قبلہ نما سوے تو ام ساختہ مائل
غالبِ لسنجن نام من آمد۔ ازل آورد — دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب — ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل
من گنجم و گردوں نہ گل اندود دہ[۵] درم را — می بین در گنج۔ ارچہ کشودن شدہ مشکل
خود در خورِ ویرانہ بود۔ گنج گراں[۵] سنگ — غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل
ہاروت۔ فسونِ نفسِ گرم چہ داند — اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل
آں را کہ بصر یرِ قلمِ ہوش رُبا باید — دیگر بزند ذوق ز آواز عنادل
توقیعِ بریلی[۵] بہ تو فرخندہ کہ من نیز — بستم بہ فرہ مندیِ خویش از کرمت دل
حاشا کہ ستانم رقمِ قاضی و مفتی[۵] — حاشا لا پذیرم عملِ شحنہ و عامل
بفرست خردمندکساں را بگلو ست — در جیبِ گدا ریز تحمیل[۵] ز مداخل
ہر سال ازاں شہر بمن وظیفہ[۵] روان دار — کز ہر ہمیں گشتہ در اقطاع تو شامل
امید کہ لب تشنگیِ من نہ پسندی — زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

زاں رشحہ یعنی مداد۔ مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے۔

امید کہ بپذیری و بر من نہ کنی قہر — نپذیرم اگر معذرتِ فرط مشاغل
امید کہ آں شیوہ نورزی کہ گویم — کز درد دلم فارغ و ازمن شدہ غافل

کیفیت آغاز موسم سرما

عید اضحےٰ بسر آغاز زمستاں آمد — وقت آراستنِ حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفتہ و سرمادہ زہوا — محمل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد

---

[۵] یعنے قدیم وظیفہ [۵] یعنے میرے کو بیٹھا کر دیا ہے [۵] گنج گراں بہا ۱۲ [۵] یعنے فرمان الحاق بریلی بہ رامپور ۱۲
[۵] اقبال مندی [۵] یہ عہدۂ قاضی و مفتی سنجو اہم ۱۲ [۵] یعنی حاصلات بریلی ۱۲ [۵] جاگیر ۱۲

روز رزمی کاهد - وشب راست درافزایش روے — موسم دیر فنودن بہ ستبستاں آمد
آذر افرور - وخرداطلس سیفور - بدوزد — مہر مہ - میرد دانیک مہ آباں آمد
ہندور فصل خزاں نیز بہارے دارد — گونہ گوں سبزہ خلی بندخیاباں آمد
دے و بہمن[۵۰] کہ دراقلیم دگر یخ بندد — اندریں ملک گل وسبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست کدیور بہ نسیم[۵۱] — گفت جانیست دگر سرزدہ[۵۲] نتواں آمد
نخل تاریخ نہ زنی کہ ہم ازمیوہ وشاخ — گوی وچوں بکف آرد دبمیداں آمد
تابرد داغ غم ہجر شقالق[۵۳] زدلش — گل صدبرگ بدلجوئی دہقاں آمد
گرنہ ایں گرمی ہنگامہ تماشا دارد — ازچہ نرگس پے نظارہ بہ بستاں آمد

صفت موسم بہار

سحر کہ بادِ سحر عرض بوستاں گیرد — دہد بہ نکہت گل حکم تاجہاں گیرد
برات برزر گل کردہ اند - پنداری — کہ غنچہ را سپہ سبزہ درمیاں گیرد
مگر بگرد گل از بہر یاس حلقہ زدہ است — کہ ژالہ را زہوا سبزہ برستاں گیرد
ستادہ سرو بداں اہتمام بردرِ باغ — کہ ابر بہار دگر راہ برغزاں[۵۴] گیرد
زشاخ غنچہ بہ سرمست شاہدے نامد — کہ بعد بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد
چمن زعکس شفق ساتگین مُل گردد — سمن زجوش طرب رنگ ارغواں گیرد
زنند گر ہمہ آتش بہ خار - گل بالد — کشند گر ہمہ پیکر زسنگ - جاں گیرد
زانبساط ہوا بعد ازیں عجب دارم — کہ مرغ قبلہ نما جادر آشیاں[۵۵] گیرد
زگل نگہ نتواں داشت دل بحیلۂ عشق — اگر زمانتواند زول ستاں گیرد
چناں بکنج چمن یافت ذوق طاعت حق — کہ شیخ شہر جوہا ترک خان ومان گیرد

---

۵۰ یعنی دردے بہمن ۱۲ ۵۱ بافغاں وکاشتکار ۱۲ ۵۲ یعنی درآنا یامنہ آنقائے ۱۲ ۵۳ لالہ ۱۲ ۵۴ گیرندہ ۱۲ ۵۵ نخواہد کی صحیحی ۱۲
۵۶ محل نقطہ ۱۲ ۵۷ مسدود سازد ۱۲ ۵۸ یعنی از آشیاں پرواز خواہد گیرد ۱۲

حریفِ جلوہ نگہ درہجوم لالہ و گل
چواں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد

چنیں کہ شاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد
چرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیت صبح

صبحے کہ در ہوائے پرستاری وطن[۱]
جنبد کلید بتکدہ در دستِ برہمن

در رفت و روبِ دیر دم گرم راہباں
آرد برون گداختہ شمع از لگن

خیزند دستہ دستہ[۲] مغاں نشستہ روے
در آرزوی چیدنِ برسم[۳] زنار و ن

از شورِ دیریاں بگمانِ خروشِ صور
اموات راز رقصِ بہ تن پردرد[۴] کفن

رخشد ستارہ از رخِ ناشستہ صبح
بالد بنفشہ از قدِ خم گشتہ شمن[۵]

بر روے خاک جلوہ کند سایہ در نظر
بر لوے دوست حاتہ زند مرغ در چمن

خوابد چراغ کشتہ چو شخص بریدہ سر
خیزد گل شگفتہ چو رنجور خستہ تن

بر جام مل زدیدۂ شبنم چکد نگاہ
بر روی گل زطرۂ سنبل دود شکن

غوغاے روز پردہ کشاید ز خوبِ زشت
آواے کوس خواب رباید ز مرد و زن

فخر و خودستائی باشکوۂ نجبت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے

---

[۱] بت ۱۲ [۲] گروہ گروہ ۱۲ [۳] برسم جھاؤ یا انار وغیرہ کی پتلی پتلی باشت بھر کی شاخیں جنکو آتش پرست عبادت غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں [۴] یعنی درندہ عنود ۱۲ [۵] شمن بت ۱۲

نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اسلیے نہ اسکو اس موقع پر بالکل مجمل انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ وہ اول سے آخر تک نقل کیجا سکتی ہے۔ لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار مندرجۂ عنوان انتخاب کرکے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کیجائے گی۔

بند اوّل

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام　　شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نور ظہور کے وقت آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے اسکو بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ نکالکر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے کہ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

انیت خلوتخانۂ روحانیاں! کا ہنجا زدور　　زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

انیت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے۔ جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش　　لولیے را در دو عشرتگہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گز اے ناداں بر سوائی نہ بینی دل کرمن　　ماہ را در ثور و کیواں را بمیزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے۔ منجموں نے دور فلک کو بارہ حصّوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو بُرج کہتے ہیں اور انکے نام یہ ہیں۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ،

میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ ان میں سے ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جنکا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تیس درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور میں) دیکھا اور زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اسلیے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرتگاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بیخبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہیں کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے اس بیان کو کسی بُرے معنی پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغزا بباغ　　سر بر سم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

بر سم خواب۔ یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیر بال پنہاں یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے۔

کلک موج نکہت گل دم زگردش تازدہ　　نامۂ فیض سحر نوشتہ عنواں دیدہ ام

موج نکہت گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیض سحر کو نامہ یعنی خط بھیرایا ہے کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا۔

کہ میں نے فیض سحر کا مکتوب جبکہ اُسکا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیض سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ طرۂ سنبل ببالیں بر پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم جھوکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالین راحت پر پریشاں پڑا ہوا تھا۔

بادِ سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید غنچہ را در رختِ خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا رساں رساں چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جسکی وجہ سے میں نے غنچے کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اسلیئے وہ گویا اپنے رختِ خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبح اوّل گو بروے کس نیاورد از حیا صبح ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب ان تمام عجائبات کی جو آخر شب اُسکو نظر آئے اُنکی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح اوّل (یعنی صبح کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لاتی مگر صبح ثانی یعنی صبح صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبح صادق اُن پر خندہ زن تھی۔ اسکے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

محرم راز نہانِ روزگارم کردہ اند تا بجز فہم گوش نہند خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اسلیے کہ کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل وخوار کردیا ہے

از بند سوم

روشناس برخ درجمع اسیرانش منم　　نور چشم روزن دیوار زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُسکا روشناس اور پہچاننے والا طرف میں ہوں، گویا میں اُس زندان کے روزن دیوار کی - جس میں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں - آنکھ کا نور ہوں

ثابت وسیار گردوں را رصد بستم بہ علم　　رشتۂ تسبیح گوہرہاے غلطانش منم

چونکہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں اسلیے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے ثوابت وسیارات کی رصد باندھی ہے تو گویا میں اسکے گوہرہاے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہاے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں -

نے زدانش کامیاب نے بہ سختی تنگدل　　شرمسار کوشش برجیس وکیوانش منم

اہل نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیوان یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے - کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی ومصیبت سے گھبرانے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اسلیے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں -

در لئیمی شہرۂ دہر از تہدستیست چرخ　　رفتہ مسکیں را زیاد و گنج پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے یہ اُسکی تہدستی کا نتیجہ ہے کیونکہ اُسکے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اُسکا گنجینہ پنہاں میں تھا

سودہ اپنے خزانے کو یعنی مجھکو بھول گیا ہے۔ مسکین سے مراد خود آسمان ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھکر بھول گیا۔

درغریبی خویش را از غصہ در دل می خلم خوردہ ام از شست او تیر یکہ پیکانش منم

یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے مَیں خود اپنے دل میں جھیتا ہوں گویا غم کی چھپکی سے وہ تیر میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دور باش پاس وضع خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

دور باش۔ ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امراو سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اسکو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاس وضع مجھکو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا۔ پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اُسکا دربان میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بہ چشم من نیاید در نظر از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

چوں بغیر از عمر کاں مفتت ہیچم مایہ نیست بنو دمم بیم زیاں گر چرخ کج بازو بمن

برمنش دستے تواند بود۔ زاں بالاترم دل نبازم شیر گردوں پنجہ گر بازو بمن

پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود" شیر گردوں سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ۔ پنجہ بازیدن دست دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل باختن بدحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر نوبت شاہی دہد والا نگاہ نبواز دبمن

بنواز دبمن۔ یعنی اُسکو میرے ذریعہ سے معزز کرتا ہے دوسرے شعر میں اُسکی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کار ہر کس ست — دیدہ ور شاہے کہ کار گفتن اندازد بمن
ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود۔ بیم نیست — خود بہ شاہاں مایہ بخشم گر بپردازد بمن
آنکہ چون در ملک ہستی سکۂ شاہی زند — سکۂ شاہی بطغرائے یداللہی زند

قولہ "پادشہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطین عہد اسقدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے وہ گردش روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ "گر بپردازد بمن" بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی آنکہ چوں در ملک ہستی الخ "مراد اس سے حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے۔

قطعات

ہزار معنی سرجوش۔ خاص نطق من ست — کز اہل ذوق دل۔ وگوی از عسل بردست
ز رفتگان بہ یکے گر تو آدمے رو داد — مدان کہ خوبی آرایش غزل بردست
مراست ننگ لے فخر اوست کان سخن — بسعی فکر رسا۔ جاہلاں محل بردست
مبر گماں توارد۔ یقین بشناس کہ دزد — متاع من زنہاں خانۂ ازل بردست

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فرمنبد — حق را بہ سجودے۔ و نبی را بہ درودے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم — مخلص صادق الولائے تو من
گر ترا شیوہ شاہدی بودے — کردمے جان و دل فدائے تو من

ور ترا پیشہ شاعری بودے — سودمے چشم و سر بہ پائے تو من
ور ترا پایہ خسروی بودے — سفتمے گوہر ثنائے تو من
چوں ازیں ہا ہیچ۔ مرا چہ ضرور — کہ شوم ہرزہ مبتلائے تو من
راست گویم۔ بہانہ چیند آرم — ناصح مشفقم برائے تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری — نیستم خوش ازیں ادائے تو من
چکنی؟ کایں فساد سیم و زر ست — وائے من! اگر بوم بجائے تو من
بتو ہرگز نداد مے رز و سیم — خواجہ! اگر بودمے خدائے تو من

دیدی آں بدگہر۔ و مہر دلایش بہ یزید — کہ بخشم آید۔ اگر زشت و پلیدش گویند
زانکہ او خود بسر ابن علی تیغ نہ راند — خواجہ از جنگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد — کہ شہیدش نبو لیسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند — نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

کردۂ جہدے کہ در ویرانیٔ کاشانہ ام — چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نہ کرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا بر خود مپیچ — زانکہ حرفے۔ زانچہ گفتم۔ خاطر خرم نہ کرد
بیتے از استاد دیدم ذوقکے بخشید لیک — ہیچ در تسکیں نیفزود و ز دحشت کم نہ کرد
ہجو تو ناقابلے در صلب آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نہ کرد
حاش للہ! ابونت در صلب آدم تہمتست — پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نہ کرد

آیا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت — نمیہ سد ز تو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم ست کہ پروردگار تا دم مرگ — بود بہ رزق ضرور یۂ عباد کفیل

چراست اینکہ نداری زراز سیاہ وسفید — چراست اینکہ نیابی براز کثیر و قلیل
فتادہ در سرایں رشتہ عقدۂ - ورنہ — نہ مردۂ تو - ونے رازق العباد بخیل
زچند سال بمرگِ تو وُتباہیِ رزق — شدست حکم خود از پیشگاہِ رب جلیل
فرشتۂ کہ وکیل ست برخزائنِ رزق — نکرد ہیچ توقف[۵] بہ رزق در تعطیل
دوم فرشتۂ کہ یادش بخیر مقروں باد — رواندا شت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفہ کنم از قول شاعرے تضمین — کہ در لطیفہ مرا ورا کسے نبودہ عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز — ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

بہ آدم زن بشیطاں طوق لعنت — سپر دند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم — گراں تر آمد از طوق عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں - مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جسکا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جاسکتا ہے - نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوان شباب میں گزر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اسکے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اُسکی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے انکے جلدو میں پائے ہیں اسلیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُسکا مرثیہ کمال صدق دل سے لکھا ہے -

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا - جو مہین نشو و نما کے

---

[۵] یعنے در تعطیل برق توقف نکرد ۱۲ [۵] یعنی ملک الموت ۱۲

زمانے میں فوت ہوگیا تھا۔ مرثیہ اسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چونکہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیے میں لکھے گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے۔ اسلیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل میں دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونوں میں بآسانی موازنہ کرسکے۔ مگر افسوس کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہمکو دستیاب نہیں ہوا۔ لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کردیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جن کی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ اُن میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

غالب	نظیری
اے دل بچشم زخم حوادث نگارشو	لب خوش نگشتہ خندہ رہ چنگ میزند
اے چشم از تراوش دل اشکبارشو	در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں بدیدہ درد گداز جگر فرست	ہرگز زمانہ جامۂ ماتم بروں نہ کرد
اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو	نارفتہ شب بدامن شب چنگ میزند
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ	وقت گزشتہ را بہ تاسف زپے مرو
اے سر بغصہ خاک سر رہگذار شو	کاینجا نشاط گام بفرسنگ میزند
اے خاک! چرخ گر نتواں زد۔ زجادرآے	ایں دہر روز کور۔ کش ایام خصم باد
اے چرخ! خاک گر نتواں شد۔ غبار شو	دست طمع بگیسوے شبرنگ میزند
اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط	دست اجل بہ تیغ سیاست بریدہ باد
اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو	از خاک مہر بردہن تنگ میزند
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن	آرائش جنازہ و دستار میکند

اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو — گوئی کہ گل برافسرد او رنگ میزند
اے فتنہ بادِ صبح وزید اینقدر مخسپ — ایں چرخ شوخ دیدہ عجب بے بصارت ست
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو — بر جامِ عشرتے کہ؟ بہ بین سنگ میزند
آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گزشت — فرزند شاہ اکبر والا نژاد مرد
تنہا ز سر گلوکہ ز دیوار و در گزشت — شیون برآورید کہ سلطان مراد مرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پر شوکت و شاندار واقع ہوے ہیں اور کوئی شعر صنعت شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقع کی عظمت جسقدر کہ بیان ہونی چاہیئے تھی اس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف نظیری کے کہ اسکا بیان اگرچہ روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سررشتہ اُس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار
با پادشاہ عہد جہا کرد روزگار
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخے کہ بود موسمِ آتش کہ بر دہد
از نخلِ عمر شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رُخ و تنِ نازک ندیدہ بود
کامِ اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار
فرزندہ خردسال و بود روزگار پیر
ہر کس[1] چنیں جمال در آرد بحشر گاہ

نظیری

آفاق پر دریغ و جہان پر ندامت ست
این روز مرگ نیست کہ روز قیامت ست
حلقے پر اضطراب - چہ جائے تمکن ست
دہرے پر انقلاب چہ جای اقامت ست
ایں ماتم کسے ست کہ از گریہ تا بحشر
بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
خوں میکند بجلوہ دل خلق گوئیا
نخل جنازہ رستہ ازاں نخل قامت ست

---

[1] مبتدا ۱۲۔

شوخی بشاہزادہ چسرا کرد روزگار — رضواں گرش بہشت دہد دغرامت ست[1]
فرزند پادشہ نشناسد معاً لقہ[2] — دل از نوید صحبت او بزم سور بود
آغوش گور بہر چہ وا کرد روزگار — اکنوں سرائے ماتم و کوی ملامت ست
اے آں کساں کہ خاک رہ شہریار را — یاراں! عجب شکاری کز دست دادہ ایم
توجیہ آبروئے منما کرد روزگار — بر سر زنید دست کہ وقت ندامت ست
ہر چند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مرد — شہباز ما پریدہ رہ آسماں گرفت
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مرد — مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرابر ہیں البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر جس رتبہ کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب

اے قوم! خویش را بشکیب امتحاں کنید
ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفل ست شاہزادہ و درہ خطر بسی ست
منعش ز عزم رہروی آنجہاں کنید
از سیوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید
از حیلہ آنچہ رای شما باشد آں کنید
ہر حرف دلنشیں کہ بگوئید و نشنود
آں حکمہا کہ بود از و آب کار کو؟
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
وں کار ہا کہ آمد از دبوی جاں کجاست
ورخود ز رفتنش نتوانید باز داشت
لہا پر از غم ست۔ عزیزاں! چہ واقع ست

نظیری

اے بزم تیرۂ! رخ چوں ارغواں کجاست
وے رزم درہمی! شہ گیتی ستاں کجاست
شوق سجود و حرمت تعظیم کمتر ست
آں ناز صدر و سرکشی آستاں کجاست
امروز غم بمسند شاہی نشستہ است
پہلو نشین خسرو ہندوستاں کجاست
آں حکمہا کہ بود از و آب کار کو؟
واں کار ہا کہ آمد از دبوی جاں کجاست

---

[1] خبر یہ [2] یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندان تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے۔ عالقہ نہیں کرتے تھے ۱۲

بیخود شوید جامہ درید و فغاں کنید
گریید و شیون و رکت و تم بر جگر زنید
ماسینہ را دریدہ بخوں غوطہ زاں کنید
زنہار پیش شاہ مگوئید و نشنید
تابوت را بجانب مرقد رواں کنید
اے اہل شہر مدفن ایں دودماں کجاست؟
حاکم بفرق۔ خوابگہ خسروان کجاست؟

یک دل نگفتہ نیست خوشی در جہاں کجاست
ہر جا بسوگ مرگ گروہے نشستہ اند
زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
برگ و شکوفہ ریخت۔ ثمر از کجا خورم
بشکست شاخ و برگ۔ مرا آشیاں کجاست
کس را سرود در خور ایں تعزیت نہ بود
پیدا کیند کاول ایں داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگویند حال چیست
صبر سخن شنیدن و تاب بیاں کجاست
آفاق در مصیبت او متحن شدہ
ایں مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں۔ نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بین نہایت دلخراش ہیں۔ متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اسکو جانے سے روکو اور وہ جو کچھ مانگے اسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح کہنا نہ مانے تو اسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو رودو اور پیٹو اور کپڑے پھاڑ ڈالو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوت مرقد میں لیجاؤ یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت موثر اور دلخراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب	نظیری
زاں سبز خط کہ بر رخِ او نادمیدہ ماند	غم خاست۔ در پیالہ می از ساغر افگنید
گردے بدان نشست و غبارے بدیدہ ماند	شد بزم تیرہ۔ پردہ ازاں رخ برافگنید
بستانیاں بماتم شہزادہ بیخود اند	شمعے کہ دہر روشن از و بود۔ مردہ است
زیں رو بود کہ پیرہنِ گل دریدہ ماند	پروانہ را بریدہ بہ خاکستر افگنید
خوں گشت در دل و جگر دوستاں فتاد	در خانہ اش ز حلقۂ ماتم خرام نیست
آں بادہ ہائے ناب کزو ناکشیدہ ماند	ایں حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید
در مدح شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر	ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشود ریختہ
در دا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند	چنیید و ہم بر آں قدحاں پرور افگنید
در وادی عدم نہ تواں رفت باحشم	بالیں ز تاب کاکلش آشفتگی کشید
ماند انچہ بود و صاحب عالم جریدہ ماند	کوتہ کنید عربدہ در کشور افگنید
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند	رفت آں سرے کہ تاج بدو سرفراز بود
خارے بیادگار لہا خلیدہ ماند	بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشین خلق	پوشیدہ چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ
بوے ازاں شگفتہ گل نو رسیدہ ماند	بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
آں سرو سایہ دار کہ بارش نمود۔ کو؟	خیزند تا بآں سرِ تابوت دم زنیم
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش ہنود۔ کو؟	عرضے کنیم و کار و دامش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت لے گیا ہے جیسا کہ اصحاب ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بندِ پنجم

غالب	نظیری
دستے ست ای سپہر ترا در ستمگری	رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
بارے برم زجور تو پیش کہ داوری	آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیداد خوی اوست	جانہاے غم رسیدہ و دلہاے بیقرار
باگل کند سمومی و با شاخ صرصری	در پیچ و تاب طرۂ پرخم گذاشتی
داغم زروزگار کہ شہزادہ بر نخورد	از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری	بہرچہ بر دلِ پدر ایں غم گزاشتی
حیف ست مردنش کہ درایامِ کودکی	روز و شبت برسمِ جنیبت ستادہ بود
بود اُستادِ قاعدۂ بندہ پروری	در زینِ خویش اشہب و اورہم گذاشتی
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کد خدا	شمع مزار و خشت لحد ساختی قبول
با فرِّ خسروانی و فرِّ تابِ قیصری	رخسارِ تخت و طرۂ پرچم[1] گذاشتی
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد	ہمت ترا بہ ملک نیاورد سر فرو
امضا پذیر ناشدہ توقیعِ شوہری	عالم بہر کہ خواست[2] مسلّم گذاشتی
جز نوعروس صاحبِ عالم نیافتند	حرمت نگاہداشتی و جاے خویش را
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بدختری	بہر برادرانِ مقدم گذاشتی
زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ حیف	خون ست بے تو گر ہمہ دل چون دل من ست
آں نونہال سرو قد گلکلاہ حیف	ہر دل کہ بے تو خون نشود سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے

---

[1] علم ۱۲ [2] یعنی بہ جہانگیر ۱۲

بند ششم

غالب	نظیری
اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ	اے شاہِ مصر دور زکنعاں چگونہ
ما بے تو در جہیم تو بے ما چگونہ	اے یوسف از جدائی اخواں چگونہ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما	ہرگاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ می کنی
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا چگونہ	با حسن شوخ در تہِ زنداں چگونہ
زاں پس کہ با تو آب و ہوای جہاں شناخت	اسکندر از غمِ تو بظلمات نشستہ است
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونہ	در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونہ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی	اے پارۂ زجاں و جگر گوشۂ پدر
با حوریانِ آئنہ سیما چگونہ	گشتہ جدا ز دیدۂ وداماں چگونہ
ما بیخودان بحلقۂ ماتم نشستہ ایم	ما بارے از فراق تو در خون دیدہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونہ	تو در میان روضۂ رضوان چگونہ
بے مطرب و ندیم و غلمانِ خرد سال	آواز نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند
بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونہ	اے بخت خوش بخواب پریشاں چگونہ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت	ایجات کار دفتر و دیواں حوالہ بود
اینجا[1] عزیز بودہ آنجا چگونہ	آنجا بگو ز پرسشِ دیوانِ چگونہ
اے بعد مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے	قلزم سبک ثبات تر آنجا ز شبنم ست
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے	در بحرِ کل تو قطرۂ باراں چگونہ
	بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند
	تا بنگریم در صفِ دوراں چگونہ

[1] خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شہزادہ مرجاتا تھا تو اسکی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اسکی سرکار جوں کی توں رہتی تھی؟

نظیری

چوں کار رفتگان دگر نیست کار تو
محشر شتاب میکند از انتظار تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں نظیری کا یہ بند اسکے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے یہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھکر پایا جاتا ہے

بند ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس
در نوحہ شاعری مکنید از من التماس
در پردہ سنجی از دم خویشم رسد گزند
در رہروی زسایۂ خویشم بود ہراس
من میہمان و چرخ سیہ کاسہ میزبان
دُردی خور ہلاکم و تلخابہ نوش یاس
باقی نماندہ اشک چہ گریم بہ ہای ہای
از کار رفتہ دست چہ برتن زنم لباس
سر حلقۂ پلاس نشینان ماتمم
اندوہ ہمدمان شہ از خود کنم قیاس
چوں بود بزم ماتم شہزادہ بے خروش
من دم زدم زتلخ نوائی بریں پلاس
از نوحہ عرض لطف سخن میتواں گرفت

نظیری

فردا کلاہ بادشہی بر سر تو باد
رسم العمل بروز جزا دفتر تو باد
فردا کہ روز حشر برانگیزی از زمین
دوش و کنار حور و پری محشر تو باد
روزی کہ کار ہا ہمہ موقوف حق شود
جبریل کارساز و خدایا وبر تو باد
وقت سوال گوش ولب منکر و نکیر
پُر از قبول نکتۂ جاں پرور تو باد
آں حلّہ کہ آدم از و ذلّ وقدر یافت
گر رحمت دو کون بود در بر تو باد
مجموعۂ عمل چو بہ محشر در آورے
کار تو راست ہیچو خط مسطر تو باد
مغز از بخور روی مزارت معطرست

عالب سخن سرای و شہنشہ سخن شناس — بوے بہشت ہم نفس مجمر تو باد
یارب جہاں ز فیض تو با برگ و ساز باد — آرم بہائے تو نشناسد دریں جہاں
عمر ابو ظفر شہ غازی دراز باد — تسبیح قدس در دل کان گوہر تو باد
نخل ریاض ملک کہ باب عزیز[1] تست — سرسبز از دعاے شناگستر تو باد
کارش بہ حسن شاہد فرخندگی بود — ہر چند بر تو مرگ برو زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اسوقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہمکو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُنکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا۔ لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرط زندگی اس نقصان کی تلافی کیجائیگی۔

اب ہمکو مرزا کی کلیاتِ نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضاے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی اُنکے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے اس مثنوی میں جسکا نام مرزا

---

[1] یعنے پور عزیز ست ۱۲

نے ابر گہربار رکھا تھا۔ انکا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ انکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی انکی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں

از توحید

سپاسے کزو نامہ نامی شود — سخن درگزارش گرامی شود
سپاسے کہ شوریدگان الست — دہندش بہ بانگ قلم دل زدست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ — ز دل جستہ و بادل آویختہ
سپاسے دوائی سوز کثرت ربائے — سپاسے دل افروز بینش فزائے
خدارا سزد کز دروں پروری — بدیں شیوہ بخشد شناسا وری
خدائے کہ زاں گونہ روزی دہد — کہ ہم روزی و ہم دوروزی دہد

* * * * * *

رضا جوئے ہر دل کہ درویش ہست — ہوا خواہ ہر رخ کہ گردیش ہست
ترنجد ز انبوہ خواہندگان — نیاید ستودہ از پناہندگان
خرد جنس ہستی فروشندگان — دہد مزد بیہودہ کوشندگان
ربایدد دل اما ز دل دادگان — کشد ناز لیکن ز افتادگان
زبانے کہ بر دل وزد در نہفت — زباں را بہ پیداد آرد بگفت
نگہ راکہ بیروں نباشد ز چشم — دہد بال پیدائی مہر و خشم

دل دوست با همه گرد و نشسته — دریں کیسه کردار اندوخته

یعنی درکیسه که از بهم دوختن دل دوست بهر سیده - کردار مردم اندوخته است .

روان وخرد با هم آمیخته — زیں پرده گفتار انگیخته

نه زیں سو گهر ها شتم دن توان — نه راه اندریں پرده بردن توان

به نیروے نه چرخ برهم زدن — نشاید زدانست او دم زدن

یعنی بقوتے که ازاں نه چرخ را برهم نیتوان زد از معرفت آلهی دم نه می توان زد .

گروهے به بندگمه یافتن — فرو بسته دل در زمیں کافتن

یکے را دم تیشه بر کان نخورد — یکے ره به نایاب گوهر نه برد

خرد کز جهانے ست پیشش خبر — نباشد ز عنوان خویشش خبر

نه بیند جزایں - هیچ بیننده — که مارا بود آفریننده

نگارنده پیکر آب و گل — شمارنده گوهر جان و دل

بگردش در آرنده نه سپهر — به گردوں بر آرنده ماه و مهر

روان را بدانست سرمایه ساز — زبان را بگفتار پیرایه ساز

به شاهی نشاننده خسروان — ز رهزن رهاننده رهروان

بدانش به اندیشش فرزانگان — به مستی نگهدار دیوانگان

جگر را ز خونا به آشام داده — نفس را به بیتابی آرام داده

شناسندگان را بخود رهنمائے — هراسندگان را غم از دل ربائے

نفسها بسودائے او نالهخیز — جگرها به صحرائے او ریز ریز

رگ ابر را اشکباری ازوست — دم برق را بیقراری ازوست

زبانهائے خاموش گویائے او — نهاں هائے اندیشه پیدائے او

خرد را که جوید شناسائیش — نگه خیره در برق پیدائیش

دوئی بے کفن مردۂ در رہش خودی دادگر شختۂ در گہش

زہے ہستی محض و عینِ وجود کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
زشاخابہ کز قلزمے سر دہد بہر تشنہ آشام دیگر دہد
بیک بادہ بخشد ز پیمانہ بہر ذرہ رقصے جداگانہ
جہانے ز طوفان بغرقاب در ہنوزش ہماں چین بگرداب در
گروہے ز مستی بہ غوغا دروں ہنوزش ہماں می بہ مینا دروں
اسیرش زبندے کہ برپائے اوست شناسد کہ بر تخت چیں جائے اوست
شہیدش بخویش از طرب بہرہ مند بجز چشم زخمش نباشد گزند

بہر لب کہ جوئی نوائے از اوست بہر سر کہ بینی ہوائے از اوست
اگر دیو سارے[1] ست بیہوش و ہنگ کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ کہ بت را خداوند پنداشتہ
وگر خیرہ چشمے بہ تیر پرست بہ دُردے از جام اندیشہ مست
بمہرش[2] ازاں راہ جنبیدہ مہر کزیں روزنش دوست نمودہ چہر
ز تاری درونانِ اہرمنی گروہے بود کز خرد دشمنی
ز بس دادِ نا آشنائی دہند بہ آتش نشان خدائی دہند
بہ تن ہا بر آذر گرایش کنان بدلہا خدا را نیایش کنان
گروہے سراسیمہ در دشت و کوئی خداوند جوئے و خداوند گوئی
ز رسمے کہ خود را براں بستہ اند بیزداں پرستی میاں بستہ اند

---

[1] دیو سار یعنی گمراہ ۱۲ [2] یعنی بخورشید ۱۲

زمہرے کہ بنیوا ست در دل بود | پرستندۂ حق گر بہ باطل بود
نظرگاہ جمعے پریشاں یکے ست | پرستندہ انبوہ و یزداں یکی ست
کدامی کشش کاں ازاں سوی نیست | بدو نیک را جز بوے روی نیست
جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی | فضاے نظرگاہِ وجہ اللّٰہی
بہر سو کہ رو آوری سوی اوست؟ | خود آں رو کہ آوردۂ روی اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن | شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازند گان | بہ سرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہاے شہوار پیش آورند | فروہیدہ[1] کردار پیش آورند
ز نور یکہ ریزند خرمن کنند | جہاں را بخود چشم روشن کنند
بہ ہنگامہ با ایں جگر گوشگاں[2] | در آیند مشتے جگر توشگاں
ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو | ز خجلت سر اندر گریباں فرو
دراں حلقہ من باشم و سینۂ | زغم ہاے ایام گنجینۂ
در آب و در آتش بسر بردۂ | ز دشواریِ زیستن مُردۂ
تن از سایۂ خود بہ بیم اندروں | دل از غم بہ پہلو و نیم اندروں
ز ناسازی و ناتوانی بہم | دم اندر کشاکش ز پیوند دم
ز بس تیر گیہاے روز سیاہ | نگہ خوردہ آسیب دوش از نگاہ
بخشاے بر ناکسی ہاے من | تہیدست در ماندہ ام وا ے من
بدوشِ ترا زو منہ بارِ من[3] | نسنجیدہ بگذار کردارِ من
کبر دار سنجی بیفزا ے رنج | گراں باریِ درد عمرم بسنج

---

[1] پسندیدہ ۱۲ [2] یعنی عزیزاں ۱۲ [3] یعنی گروہے از جگر خوراکاں ۱۲ سیزان اعمال ۱۲

که من باخود از هرچه سنجد خیال — ندارم بغیر از نشانِ جلال
اگر دیگراں را بود گفت و کرد — مرا مایۂ عمر رنج ست و درد
چه پرسی چو آں رنج و درد از تو بود — غمے تازہ در ہر نوا از تو بود
فروہل کہ حسرت خمیرِ من ست — دم سرد من زہریرِ من ست
مبادا بہ گیتی چو من ہیچ کس — جہیمی دل زمہریری نفس
بہ پرسش مرا در ہم افسردہ گیر — پرکاہ را صرصرے بردہ گیر
پس آنگہ بدوزخ فرستادہ داں — در آتش خس از باد افتادہ داں

پرسش سے مراد باز پرس قیامت ہے کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرکاہ کو بادِ صرصر اُڑا لے گئی اور یہ فرض کر لے کہ میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گر چکا۔

وگر ہمچنیں ست فرجام کار — کہ می باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجام کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو

مرا نیز یارائے گفتار دہ — چو گویم براں گفتہ زنہار دہ[۵]
دریں خستگی پوزش از من مجوی — بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اُس پر مجھ سے عذر مت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود — چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم آماز تست — بہ تست ار چہ گفتارم انداز تست

---

[۵] پناہ ۳

همانا توانی که کافر نیم | پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را به اهریمنی | نبردم ز کس مایه در رهزنی
مگر ہے کہ آتش بگورم ازوست | بهنگامه پرواز مورم ازوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اُسی سے میری زندگی ہے اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگورم ازدست اور پرواز مورم ازدست" منتہاے بلاغت ہے نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اُسکو پرواز مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اسکی موت کی علامت ہے اسی طرح نشہ شراب کا عارضی نشاط آخرکار موردِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندوگہین وے ایزدہ ربائے | چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مے و رامش و رنگ و بوے | ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند | دلِ دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب من گاہ گاہ | بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستان سرائے نہ میخانۂ | نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بربساط | نہ غوغاے رامشگراں در بساط
بسا روزگاراں بہ دلدادگی | بسا نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باراں و شہاے ماہ | کہ بودہ است بے مے بچشمم سیاہ
افق پاڑ از ابرِ بہمن مہی | سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں! و من در خمِ برگ و ساز | در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بوی و رنگ | من و حجرۂ و دامنی زیر سنگ

---

۱۲ نغمہ ۱۲ مطرب ۱۲ مطرباں ۱۲ بند ۱۲۔

دمِ عیش جز رقصِ بسمل نہ بود
به اندازهٔ خواهشِ دل نہ بود

اگر تا قیامت رشتہ گوہر شکست
وگر یا فتم بادہ ساغر شکست

چہ خواہی ز دلق ملمع آلود من
ہمیں جسمِ خمیازہ فرسود من

بنا سازگاری ز ہم سایگاں
بہ سرمایہ جوئی ز بے مایگاں

مہ از منتِ ناکساں زیرِ خاک
لب از نا کبوسِ خساں چاک چاک

بہ گیتی کرم بینوا داشتی
دلم را اسیرِ ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہر بار زر بیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانجا بر انگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

ز نازک نگارے کہ نازش کشم
بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

بدیں غم ناخوش کہ من داشتم
ز جاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے
زدل بانگِ خونم بگوش آیدے

ہنوزم ہماں دل بجوش اندرست
زدل بانگِ خونم بگوش اندرست

چو آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیا سایدم

دلے را کہ تیر شکیبد بہ باغ
در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شراب طہور
کجا زہرۂ صبح و جام بلور

دمِ شب روبہاے مستانہ کو
بہنگامہ غوغاے مستانہ کو

درانِ پاک میخانۂ بے خروش
چہ گنجائی شورشِ نای و نوش

سیہ مستیِ ابر و باراں کجا
خزاں چوں نہ باشد بہاراں کجا

اگر خورد دل خیالش کہ چہ
غم ہجر ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار

گریزد دمِ بوسہ امنیش کجا
فریبد بہ سوگند دنیش کجا

بَرد حکم و نبود لبش تلخ گوے — دہد کام و نبود دلش کامجوے
نظر بازی و ذوق دیدار کو — بہ فردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلّالہ — نہ دل تشنۂ ماہ پرکالہ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل — ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگے را بکاود زدل — دو صد دجلہ خونم تراود زدل
بہر جرم کز روے دفتر رسد — زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائے کایں داوری چوں بود — کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہمچوں منے را بہ بند — تلافی فراخور بود لنے گزند
چریں مویہ در روز امید و بیم — بگریم بدانساں کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جوے — تو بخشی بداں گریہ ام آبروے
وگر خونِ حسرت ہدر کردۂ — زپاداش قطع نظر کردۂ
گزشتم زحسرت۔ امیدیم ہست — سپیدیم آب روی سپیدیم ہست
کہ البتہ ایں رند ناپارسا — کج اندیشہ گبر مسلماں نما
پرستار فرخندۂ منشور تست — ہوادار فرزانۂ دخشور تست
بہ بندِ امید استواری فرست — بہ غالب خط رستگاری فرست

محمد کز ائینۂ روے دوست — جز انیش ندانست داناکہ اوست
زہے روشن آئینۂ ایزدی — کہ در روے نہ گنجیدہ رنگ خودی
زرازِ نہاں پردۂ بر زدہ — زذاتِ خدا معجزے سر زدہ
تمناے دیرینۂ کردگار — بوے ایزد از خویش امیدوار

لہ یعنی قرآن ۱۲ کہ نبی ۱۲

تن از نور پالودہ سر چشمۂ — ولے ہمچو مہتاب در چشمۂ
بہر جام از دلشنۂ جرعہ خواہ — بہر گام از و معجزے سر براہ
کلامش بدل ۔ در فرد و آمدن — زدم جستہ پیشی بزود آمدن
خرامش بسنگ از قدم نقش بند — برنگے کہ نادیدہ پایش گزند
بہ دستش کشاد[1] قلم نارسا — بکلکش سوادِ رقم نارسا
دل امید جای زیاں دیدگاں — نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں
برفتار صحرا گلستاں کنی — بگفتار کافر مسلماں کنی
بدنیا زدیں روشنائی دہی — بعقبیٰ ز آتش رہائی دہی
بخوے خوش اندوہ کاہ ہمہ — بآمرزش امید گاہ ہمہ
زبس محرم پردۂ راز بود — بنزدیکیِ حق سرافراز بود
زرازے کہ باوے سرودے زادل بگوش — صدائیش بودے زادل بگوش
خہے قبلۂ آدمی زادگاں — نظر گاہِ پیشیں فرستادگاں
کسائی دہ نسل آدم بخویشش — روائی دہ نقد عالم بخویشش
بلندی دہ کعبہ بالائے او — گرامی کن سجدہ سیمائے او
یمن روشن از پرتو روئے او — ختن بستۂ چین گیسوئے او
زبت بندگی مردم آزاد کن — جہانے بیک خانہ آباد کن
بحراب مسجد رخ آرائے دیر — بہ اندیشِ خویش[2] و دعا گوئے خیر
تو گوئی زبس دل زدشمن رہاست — کہ سنگِ درش سنگ زاہن رباست

نثر فارسی | مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاتا

---

[1] کنایہ از آدمی بودن ۔ [2] یعنی خویشاوند ۱۲

ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کیجاے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیم روز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتدبہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پولٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید، اور جلال اسے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ انکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن و بان میں بےنظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لیجائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے لیکن جب مرزا کی نثر کا اُن دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا اُنکی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضاے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوتی ہیں اُنکو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کیجاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے اسلیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ اُن اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی

زبان کے ساتھ باوجود اُسکی کساد بازاری کے ابتک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو اُمید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ووافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں اُنکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تاوقتیکہ اُسکو دلیل وبرہان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بیمعنی بات ہے لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں اُمید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرز انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اسلیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم انکی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور باایںہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں بریکیٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد، شصت کو شست غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آور اور تدرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے

اسلیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقہ کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کے نمونے

از مہر نیم روز

خطاب زمیں بوس مہر نیم روز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح بادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کرکے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطاب زمین بوس رکھا ہے۔ اسکو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"قاآن شیوۂ خاقانا او خواقین خدائیگانہ ارد[1]ی آوردن من از عدم بوجود بسودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود، کالائے بیش بہائے من دریں چار سو روی روائی ندید، و متاع گرانمایۂ مرا دریں بازار ارزش ارزانی نہ شد، ناچار ہر چہ[2] باخویش آوردہ ام۔ چوں گویم کہ باخویش می برم۔ لختے در سفینہ ہا، و پارۂ در سینہ ہا میگذارم۔ پس از من آں گنج شایگاں را گر ہمہ باد ببرد اگر ہمہ خاک بخورد کو بخور۔ سینہ آرزوہائے جواں میررا مدفن ست المعۂ نگاہ کرم چراغ گور غریباں باد۔

نیاگان نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماندہان بافرہ فرہنگ۔ فرد مردن چراغ ہستی نوردیدۂ تو بہ باد آستین کینہ کیخسر و پشنگیاں را

---

[1] مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ ان نقطوں کے بعد جنکے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی فصاحت کی طرز پر یائے نائد لاتے ہیں۔ مثلاً ردیا سوپلا ور جاگی جگہ ردے سوے پاے اور جائے لکھتے ہیں ۱۲

روز سیاه پیش آورد خداوندان اورنگ و دیهیم را ازاں برگ و ساز ها جز تیغ گند ناگوں بکف نماند - بمرز و بوم بیگانه روی آوردند، و بدست مزد تیغ زدن ناں خوردند - هم ازیں نیشاں ایوانان کسار نشیمن بلوقیاں دگر باره سر بافسر و افسر بگوہر آراستند - چرخ گردنده چنانکه خوی اوست این نامداران کاوس کوس را نیز از پای افگند -

در مشرب ما خواہش فردوس بخوئی — در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادهٔ اندیشهٔ ما دُرد نه بینی — در آتش هنگامهٔ ما بود نیابی

از واپسیان این قافله نیاے من - که قلمرو ماوراالنهر، سمرقند شهر مسقط الراس وے بود چوں سیل - که از بالا به پستی آید - از سمرقند بهند آمد - در دفتر پهپدیشاه نشان ذوالفقار الدوله میرزا نجف خاں توقیع نوکری شاهش نوشتند، و پرگنه رہا سوبرات روزے دے وسپاهش نوشتند - پدرم پیشهٔ پدر خویش داشت، و هم در کارزار جامه گذاشت - همانا گابن ثنائے ترا نوآئین نوا بلبلے همی بایست که مرا زمزمه سنج دستانسرائے آفریدند -

رباعی

غالب بگهر زدودهٔ زادِ شم — زاں رو بصفائے دم تیغیست دمم
چوں رفت سپهبدی رم چنگ بشعر — شد تیر شکستهٔ بناں قلمم

خاکم بسر که بفریب پندار آزاده روی بسخن لا ابالیانه پرداختم، و اندازهٔ ارزش سخن و پایه و لآلی گوہر خویش نشناختم - سینهٔ من نفسے داشت بروان آسائی نسیمے که از نسترن زار وزد، زیان زده - من که دم جز به ناباسیت نه زدم دبنان مرا قلمے بود به دجله باری ابرے که از قلهٔ خیزد بهمده کوش من که

باراں بشورہ زار فرو ریختم۔

باایں فروغ گوہر درخشاں نہاد زیں ساں سیاہ روزگار کرد روزگار

با فرہ فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن با فرومایگاں ہمنشیں / و با او باشں ہم رنگ، پائے بیراہہ پوے وزبانِ بیصرفہ گوے، در شکست خویش اگ دوں راد سلیار، دور آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پر از خار خار، و دیدہ نشتر زار، نہ دستگاہ خود نمایانہ آرایشے، و نہ سرو برگ آزادانہ آسایشے۔ سرگزشت ہر کس ہماں فرماں ہائے امضا پذیرفتہ سرنوشتِ اوست، در آنچہ بر من رفت دوستاں را با من چہ جای سرزنش، و مرا با دشمناں چہ گنجایی پرخاش

لنگر گسست صرصر کوشی شکست موج دانا خورد دریغ کہ نادال چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیز رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیگد گرزد، بفروغ آں فرہ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرتاب داد گری دل افروخت، و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت، بداں در[۱] فردوم آوردند کہ تو نیز چوں حلقہ۔ چشمے بداں درداری، و نتوانی کہ دیدہ بر داری +++ تا ہمسایۂ اویم سپہریاں در سایۂ من اند و تا خاک نشین آں درم فرشتگاں در رشک پایۂ من اند در دل دویدۂ روشناں جاے من ست، و بر سرماہ و ستارہ پاے من۔ دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیۂ رحمتے کہ بر از بالا فرود آمد۔ رود ادن خجستگی زمیں بوس گیہاں خدیو خدا داں بود۔ دولت رو آورد، بخت از خواب جست، حور چشم روشنی گفت رضواں بدرضا جوے آمد۔ چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ تجلی طلبید۔

---

[۱] اس درے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا اگلے مکان میں رہتے تھے

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر تو میدیم دگر بہ تو امید وار کرد

کالبد خاکی مراچوں پیکر گرد باد جانے درمیان نیست، ہمیں یک دو مرتبہ سر گشتگی تماشا دارد مگر عندلیب گلشن تصویرم کہ ببوے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزۂ جوہر شمشیرم کہ بوزیدن بازمست نیارد چمید گستگی پیوند نشاط کہن شد، وخون از دل ہمچناں در چکیدن ست تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ وچہ مایہ بہ زور گستہ اند۔

شبے بادل دیوانہ کہ لختے از من ہوشمند ترست۔ گفتم کہ اگر گفتار نپذیرد وہی بشاہ ارم کارگاہ بارگاہ عرصہ دارم کہ آئینہ رازم۔ مرامی تواں زد و بندہ سخن طرازم۔ مرامی تواں پرورد گفت اے ناداں ایں سخن از جاے دگر بود وہنگام آں گذشت، اکنوں اگر ہمیتوانی گفت بگوے! کہ خستہ ام۔ مرہم می تواں نہاد، و مردہ ام۔ جاں می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا ہمہ چند دایہ جوے آمدہ ام دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام

آبم کہ محیط را بجوے آمدہ ام رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بدوران تو ام۔ بروزگار فرزانہ جمشید بودمے۔ جمشید روزگار را آفریں گفتے، واگر بدانساں کہ ثنا خوان شہریارم۔ فرخ فریدوں راستودمے۔ فریدوں چرخ وستارہ را گرد سر گشتے۔ دراں انجمن کہ زر دشت آتش افروخت، وژندآورد اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتے۔ آذر از بیم من زبانہ نہ زدے، واز لفز بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے من بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوندکار فرمائے دارم۔ ہر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد، سرت گردم! تو نیز بدیں گرمی ہنگامہ نباز۔ کہ ہیچو غالب بندۂ آتشین نوائے داری، اگر بہ انداز ہنر داد التفات ندہی۔ حاے مردک دمدہ بمہر باز گزار، و در دل بروی من بکشای۔

گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بفرمان آں خسرو دریا دل کلیم را صدرہ بسیم و زر لعل و گہر سنجیدہ اند، من آں خواہم دیدہ دراں را دستوری دہی تا از کشش کوشش نہ رنجند، و یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجند۔

پریشاں نوائی من در ستایش گفتار خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، و ہیچگاں بر خود گمان کمالے نبردمے۔ سرمستی ذوق برگزیدن ایں والا نظر کہ برگزیدۂ نسبت مرا از من برد، و خامۂ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد۔

ہمانا بلند نامی سلطان دہر در آفاق چشم داشت، کہ چوں منے زاکہ بجاد و بیانی شہرہ آفاقم بکردار گزاری گماشت۔ من خود ازاں روم کہ دل و زبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبان شاہ است دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ۔ فرمان شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کار ہر کس ست دیدہ ور شاہے کہ کار گفتن انداز دبمن

نامہ نگار کردار گزار را بہ تنومندی توفیق سرانجام خدمت سعادت جاودانی، و خاقان را بہ سایہ سواد ایں نگارش کہ ظلمات آب حیواں ست حیات ابد الزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے مہر نیمروز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اسکے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائیگی۔ اسکے بعد کہتے ہیں کالا شناسی رانہ آں آئیں ست

۱؎ خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی کے لیے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا۔ یہاں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۱۲

کہ نکوئی کالائے خویش از نظر اندازند، و پرکار کشائی (تصویر) را نہ آں دستور ست کہ بر ہر پیکرے کہ خود کشند عشق نہ بازند۔ مگر مانی آں نقش (نام رقاص) را کہ خود میزداز اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بند سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم رفتار کبک و تدرو دل از دست برد، خرام ایں رعنا (یعنی مظہر) بیت رقاص سرمست نکند؟ حاشا کہ خرامش کلک بر ورق ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود تیر ست کہ (مسنون نشوم) بسنبلہ در حالت سرمستی تصیم[1] خود نمایا نہ بنازمی خرامد۔ ایں پارسی آمیختہ بہ تازی کہ از زباں چیرہ دستی عرب بر عجم (علیہ) در گیتی پدید آمد۔ خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامہ من قفل درش را کلید آمد۔ پرویز کجا ست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجا ست تا فرار سد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔

خسروی بادہ دریں دور اگر میخواہی پیش ما آے تہ جرعۂ از جامی ہست

خود ستائی فروہلم، و بند پندار بگسلم۔ آوخ ازاں روزگار کہ از خوی بنا سازی (خصم وکام) و از کار بازی سپری شد، و داد ازاں بیداد کہ در ورزش (شوق) افزونی خشم و کام بر رواں و ہوس رفت۔ از کار فرماے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بر داختن ایں نمط کہ خود را چوں سایہ باز میں ہموار ساختہ ام تا پرداختہ ام، و با (یعنی نکہم احسن اللہ خان) یعنی بساط مرد آزاں (آصف جاہ بہادر مرحوم) ایں نقش۔ کہ چشم و دل و نگاہ و نفس با ہم آمیختہ ام تا انگیختہ ام۔ دست از کار ہاے دگر کوتاہ است، و دل از اندیشہ ہاے دگر بر کنار۔ نامہ نگار۔ کہ از کردار گزاری بگفتن درد دل روی آوردہ بود۔ باز بہ پاے سخن می آید

---

[1] تصیم اور احتراق منجمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہ نسبت احتراق کے ۴۴ ۳ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ تصیم میں ہے الغرض ستارہ کا تصیم میں ہونا اسکی عمدہ ترین حالت ہے ۱۲

وجادۂ کہ نشان دادہ اند می پیمایند نگرندگاں ہمہ تن چشم باشند، وشنوندگاں سراپا گوش۔

طرز واقعہ نگاری

مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اسکی بھی لکھی جاتی ہیں۔

از روداد قبل خاں کہ از نیاگان امیر تیمور ربود

خانِ خطا باخویشتن سنجید کہ باقہر ماں قوم مغل مہرورز دمہرانگیز نامہ رواں داشت، وگزیدہ روستے را بہ نامہ بری ویانجی گری گماشت۔ فرستادہ آمد، وجہاں پہلواں قبل خاں را زمیں بوسید، ونامہ سپرد وپیام گزارد۔ صرفہ در آشتی بود نہ در فروگذاشت۔ قاچولی بہادر را بجاے خود نشاند، وبہمعنانی نامہ آور تو سن تیز گام سوے خطا راند۔ وفرماندہ آں کشور سرانِ لشکر را پذیرہ فرستاد، ومہماں را بخوشترین نشیمن فرود آورد وپادشاہِ سپہر بارگاہ بریک خواں نشستند، ونان خوردند، وراوق آشامیدند مگر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطائیان زہر بہ بادہ آمیزند، وبدیں رنگ خوں مہماں ریزند، در بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بروں آمدے، وبہ ستم شگوفہ کردے، وخوردہ آشامیدہ از دہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بارہ ساغر گرفتے، وخوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ نیرومند وزورآور کسی ست کہ از ما بیشتر میخورد وخورش را بروے گرانی نیست، ومے از ما فزوں تر میکشد وہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادۂ پرزور دمادم خورند ہر چند ہر بار بشگوفہ اند ازند۔ نہ آنست کہ مستی روے ندہد۔ وتاب مے وزبونی قے منش را بہم بر نزدند۔ شبے بادہ برخرد ور آورد۔ قبل خاں ریش دارے خطاکہ التاں خاں نام داشت۔ گرفت ولبسوے خود کشید، وناسزا گفت۔ میزبان

خشم فرو خورد، و نزدیکان خود را که بهم برآمده بودند از گستاخی باز داشت - بامداد
مهمان آهنگ بازگشت سر ود - میزبان که از بدمستی دو سینه سرگران بود چنانکه
میزباناں دامن مہمان زود از دست نمی نهند، و آرزوے دیر ماندن کنند
نکرد کلاه های گوهر آگیں، و کمرهای زرین، و رخشنده نگین های بیش بها
و بربسته های پرنیان و دیبا پیش کشید، و پدر و دکرد هنوز رهرو دور نه رفته
بود که بدآموزان التتاں خاں را از جائے بردند، و برآں آوردند قبل خاں
از راه برگردانند، و بدرگاه آورند، و کالبدش را بدشنه و خنجر از هم فروکشایند -
سخن بنرمی گزارندهٔ ستاره از سپهر فرود آرنده - بدیں کار کمر بست و قبل خاں
را براه دریافت و بباز آمدن فریفت - رسیده رام نه شد، و از راه برگشت - فرستاده
تنها باز آمد و بفرستنده خبر داد - بگروهے از گرداں ویلاں فرماں رفت که حلقوم سنجته
شتابند، و هر کجا بابند اگر بشاوی و رادی نیاید بخواری و زاری آورند - مگر
قبل خاں را براه دوستی بود از دودهٔ ستوده سلجوق - بکاشانه وے فرود آمد
دانم از بهر آسایش آهنگ دو سه روز آنجا خورد داشته باشد خطائیاں شوریده
مغزدراں ده رسیدند، و خاں را دراں خانه دیدند - سخن بداں الا به ساز کردند
که خاقان قریب خورد، و خواست که سوے خطا برگردد - خانهٔ خدا که خرد از مهر
فزوں داشت - نهفته باد پاے پیش کشید و گفت کار ها دگرگون ست،
رفتن بخطا خود بهیچ روے روا نیست - تنها بدیں گروه میاویز، و بریں باد
توسن نام برنشین، و سوے ایل و اولوس بگریز - ناگزیر همچناں کرد، و جان
گرامی به تیزگامی برد - خطائیاں روے بازگشتن نداشتند پے امید گاه

لہ یعنی سیکه بلطف زبانی و حیله سازی ستاره را از سپهر فرود آورد ۱۲ سه پے برداشتن تعاقب نمودن - امید
گاه تکاپوے خویش یعنی کسی که در طلب او تکاپو می نمودند ۱۲

تگاپوے خویش - برداشتند - خانِ سپہر آستاں نخست بآرامش جا رسید و خطائیان سپس - باقاجولی بہادر و فرزانگاہ لشکر سگالش رفت کہ چہ می باید کرد - انجام کار بہ بہبود یکدگر بدخواہاں را کشتند، تا از تہمیکہ کشتند چہ در وند -

شہریار قبل خاں از یک بالوے نکو دیدار - کہ از قوم قنقرات بود بشست پسر داشت - نخستیں و دومیں بہ اوگیں یرقاق و قویلہ خاں نام آور، و دیگراں بہ نامہای دگر روشناس روزے نخستیں ایں دو برادر - نام اور ناگاہ بہ شکارگاہ ہمراہاں جدا ہمی ماند، و راہ گم کردہ ہر زہ ہمی گردد - تاتار خانیاں - کہ غارتگری پیشہ داشتند، پیرامن قلمرو مغول ہموارہ راہ میزدند - باین شہسوار پریشاں رفتار بر میخورند - وچوں می دانند کہ کیست با سیری می برند و بلتاخان خطائی می سپرند - خان کہ دلے پر داشت فرماں می دہد کہ شاہزادہ را بر خرچوبیں بہ میخہاے آہنیں بردوزند، و تن نازنینش از رواں پردازند - خداوند مغولستان راکہ از پیش رنجور بود بجگر تابی ایں داغ درد افزود - چوں دانست کہ ناکام ہمی باید مردود میں پسر خویش قویلہ خاں را بہ جانشینی گزید - و بہ کشیدن انتقام خون برادر وصیت کردہ چشم از تماشاے جہاں پوشید - قویلہ خاں تانگین سلیمان بکف آورد و بفراہم آمدن سپاہ فرمان نبشت - فرماں براں و کینہ خواہاں از ہر سو بہ تخت گاہ روی آوردند -

شہنشاہ دانا دل دیدہ ور — کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
براں شد کہ لشکر فراز آورد — بسوے خطا تر کتاز آورد
زمرداں و گردآں وکند آوراں — بہ جنبش در آورد کوہے گراں
ازاں روکہ بالیست خونریز شد — منش با بخوں ریختن تیز شد
دلیراں زدشمن کشی دم زدند — زدم باد بر روے پرچم زدند

ز تاتار تا گرد انگیختند به بنگاه خان خطا ریختند

التان خاں دل و دست و عناں و سناں بکار آورد، و خود را با سپاہے از ستارہ بشمار افزوں تر۔ بہ پیکار آورد۔ کوشید و کوشیدن سود نداشت رقم فیروزی بنام قویلہ خاں کشیدہ بودند۔ شکیبائی گسست، شکستے بر خطائیاں اُفتاد، علم ہا واژگوں شد، و اندیشہ بگریز رہنمود۔ جہانبان التاخاں بگریختن جاں بُرد۔ و تن ہائے خستہ و دلہائے شکستہ از میاں بُرد۔ بشہر اندر آمد، و در بروے سپاہ کینہ خواہ بست۔ قویلہ خاں و لشکر یانش نہ آنمایہ۔ برگ و ساز بہ یغما رہ بودند کہ در اندیشہ گنجد۔ سپاس گزار چرخ واختر گشتند و گرانبار و سبک عناں برگشتند۔ پادشاہ بجشم روشنی پیروزی سپاہ رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد۔ ہنگامۂ جشن گرمی پذیرفت و بزم سوار آرایش یافت خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آرائے، مرگ را، نہ آں خدنگ بہ کمان ست کہ خطا کند، قویلہ خاں را نیز ہنگام خویش ناوک برنشاں خورد چوں پسر نداشت بُرتان بہادر جائے پدر از برادر گرفت۔ بسکہ دلیر و مردانہ بود نامش از خانی بہ بہادری درجہاں رفت۔ بروزگار جہانداری ایں شہریار دلاور۔ برقِ اجل خرمن ہستی قاجولی بہادر سوخت، و پسرش ارومچی بر آں پسر لشکری رُخ افروخت۔

پارۂ از احوال امیر تیمور

روزے میانۂ امیر قزغن[1] و امیر طراغائے[2] در بارہ اولوس وقشون سخن می رفت و فرزانۂ فیروزی فر امیر تیمور دلاور با پدر ہمزباں بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود بشگرفی سخن سرائے شد، و بداں ہنجار زمزمۂ چند بر تار گفتار زد کہ امیر قزغن در آں شیوا بیانی و گہر افشانی بمہر دل بست

---

[1] امیر قزغن نام یکے از امرائے چغتائیہ ۱۲ [2] امیر طراغائے نام پدر امیر تیمور ۱۲

وبا آفریں زباں برکشاد۔ سخن گوے فرو ہیدہ ادا را لپسر خواند، و ہمداراں بزم
او لیا پیتو ترکان خواہر امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئین دین و قانون شرع
بوے سپرد۔ تا خویشی بر خویشاوندی افزاید، و آمیزشے چوں شیر و شکر درمیان
آید۔ امیر جہانخوے پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشین و ہمدم
و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ بر لاش دولاوران
چغتا ہر کہ آں دست بر دنگ ستے شگفتی فرماندے "دوستت مریزاد" گویاں دست
و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ دامادش تغلق تیمور ناگاہ در شکار
گاہش کشت۔ جہاں پہلوان تہمتن تواں بہ تنہا دامنِ ہمت والا گرفت،
و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ — در عہدۂ رحمت خدائیم ہمہ
در جلوۂ دید چناں کہ مائیم ہمہ — شایستۂ لفت و بوریائیم ہمہ

برادر زن صاحبقراں ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہر چہ
از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید بر یکدگر بخشش کنیم، و باہم جز مہر و باقوم
جز آرزم، و با خلق جز داد نہ ورزیم۔ بخون گرمی ایں دو گرد دلاور و دو شیر
مردم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے دسترگ سپاہے فراہم آمد۔
صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل بازباں یکے داشت و امیر حسین
ہمواره در کمین آں بودے کہ اینباز را از میان بردارد، و بیکتائی علم دارائی افزارد
از دیدہ دری لبسگالشہاے آں نژندانِ اندیشہ ناراستی پیشہ پے بردے۔ و از فرزانگی
و مردانگی ہیچگاہ بر دنیاوردے۔

ستم بجاں کج اندیش می تواں کردن — خجل ز راستیِ خویش می تواں کردن

ف یہ رباعی گویا آیندہ آنیوالے مضمون کی تمہید ہے ۱۲

روزگارے دراز تر از رشتهٔ طول امل - با ملوک طوائف در کجدار و مریز دستیزد آویزگذشت همگنان چشم براه و گوش بر آواز داشتند تا یل اسفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد - دیرژه امیر حسین کہ حیز بر یود غریو در نگ و نیرنگ کار نمی کرد، و در انبازی و دمسازی - فتنه پردازی و شعبده بازی شیوه داشت - نیرنگ سازیِ اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را نازم کہ هم آن گروه بے شکوه را سو بسو پاے بسنگ خورد ے، و هم این گرد بے دستبرد را جابجا دست از کار رفتے - صدره اتفاق افتاده است کہ این نفاق پیشگان خرد دشمن خون گرفتهٔ را از نژاد چغتا خان دست گرفته بر تکیه گاه خانی و مرزبانی فشانده اند، و زود نه دیر شمشیر بر سرش رانده اند - تنهاے پیلتنان رامسند و نطع از پے هم مهیا بود، و سروران را ناز بالش و خشت گور از پس یکدگر آماده

سیر ستاره و روش چرخ نیلگوں — اینها کند هر آئینه در مذهب حکیم
اما من آن نیم کہ پسندم طریق وهم — زاختر چه شکوه چوں نبود جز خدا قسم
نبود بجز ظهور صفات و شیون حق — صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
توقیع معنویست گر انصاف در ستم — تشریف خسرویست گر اطلس و گر گلیم
از حق بود اضافهٔ هستی بهر صفت — جز دایه نبود انچه به سائل دهد کریم

همچنین بارها امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتاده است - و سلطان سام هم آورد، افراسیاب همتا - برلابه گری و ے بخشوده بیاری دیاوری دل نهاده است کینهاے نهانی امیر حسین آشکارا بود - همه می دانستند، و خدیو همه دان از همه فزون تر می دانست دانم کہ در ضمیر حق پذیر آزرم[1] ناگزیر - می گزشته کہ باشد کہ مگر این سست مهر خو هاے زشت و کردار هاے نکوهیده بگذارد

[1] آزرم ناگزیر کسیکه او را از آزرم و مروت چاره نباشد ۱۲

وجاندار راد گر بنا راستی وجہانیاں را سپس بہ دراز دستی نیازارد۔ آں نا جوانمرد رافرۂ ایزدی کجا کہ بخشم وکام نگردد، وراہ دانش و داد رود۔ و در آزردن دل آزرم نداشت و در بردن زر شکیب، و در کشتن خلق پروا توپارسا طلبی عاشق ومن آں رندم کرمے بجلقہ او باش آشکار کشد

پایان کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جواں میر خداگیر[1] را بہر چہار پسرش گرفتہ آورند و بجداو ندگار سپردند۔ دارائے نبرد آزمائے را آہنگ عاجزکشی نہ بود وخون گرمی پاداش (یعنی جوش انتقام) نداشت۔ می خواست برنا بخشودنی بخشودن وگناہان نا بخشیدنی بخشیدن از نہاد اہل بزم خروش برخاست۔ خاصہ شاہ محمد مرزبانِ بدخشاں، و شیخ محمد بیاں۔ سلدوز، و امیر کیخسرو۔ کہ ریشہائے نودنا سور ہائے کہن داشتند زخمۂ تیز ترزدند، و نبوہائے خونچکانِ خوننابہ فشاں فغاں برآوردند کہ ماقصاص خوں ہائے ریختہ می خواہیم نہ انتقام فتنہ ہائے انگیختہ کہ والی ولایت آں را بحل تواند کرد۔ ناگزیر بدیں گفتار فرجام گیرودار بشرع حوالت رفت۔ کار آگاہاں ودانش پناہاں خوں ریختن فرمودند۔ وسادات وعلما بہ کشتن فتوی دادند۔

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ بدر برد۔ وپیش وزاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد۔ از انجا کہ سلاح وسلب نداشت سراسیمہ از جا رفت، و آخر گاہ بدرگاہ بدر آمدہ بجنگ سیلی ومشت رہ گریز پیش گرفت خوں خواہاں بخوں گرمی در وے آویختند، وخونش را کہ بدویدن گرم شدہ بود گرما گرم برزمین ریختند

---

[1] خداگیر کسیکہ بغضب خدا گرفتار شدہ باشد ۱۲

تو ای ندیم کہ مانی ز تازہ روئی خویش — بسبزۂ کہ سر از طرف جوئبار کشد
فریب مہر مگر دل محوز کہ ایں بے مہر — دہد فشار کسی را کہ در کنار کشد
ہوائے تاج شہی ہر کرا بود در سر — سرے بمدفن شاہان تاجدار کشد

پارہ از احوال ہمایوں و شیر شاہ | شیر خاں را دل دگر بود و زبان دگر بہ لابہ گری و فسوں گستری پیام آشتی در میان داشت تا چناں شد کہ ہیچکس را ستیزہ در اندیشہ نگذاشتے ازاں گل دلاے کہ در راہ پیمودہ بودند، و روز و شب از رہروی۔ لختے از شناوری نیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بود۔ و سوار فرسودہ اندام، دستور پشت ریش۔ فریب دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراج غنیم کشیدند، و دم آسایش غنیمت شمردند۔ پایہا بہ جادۂ زہ دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورت دیبا بہ بستر پیوند پذیرفت۔ سر از بالش برنمی خیزد تا کلاہ و مغفر را چہ کنند، و پیراہن حریر بر تن گراں ست تا چلقد و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر رشحہ فشاں تیغ در نیام زنگ بست، و ہند زین بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دمے۔ کہ تیرگی تار میغ جہاں را فرو گرفتہ بود ہنگامہ سازاں ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگاں ریختند شنگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ ہنرا ہنر در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر و پاردم از افسار نشناختند۔ از رخت خواب جستہ و بر اسپان بے زین نشستہ پراگندہ ہر طرف تاختند۔ گروہے "ہر چہ باداباد" گویاں سوارہ خود را بدر زدند۔ و ہنر درے چند ساحل جویاں بہ شنا دست و پا زدند۔ تا کدامان بزخم دم تیغ و کدامان بہ خم موج رود مردہ باشند، کدامان از طوفان ایں دو آبہ (یعنی آب تیغ و آب رود) جاں بسلامت بردہ باشند۔ شہنشاہ بحر و بر

(ہمایوں) نہنگ دشت نورد دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل در آب افگند۔ پائے از رکاب، و عنان از دست و اسپ از خمِ ران بدر رفت۔ و شاہ سوارے کہ شاہان ہنگام سواری بوسہ بر کالبش می زدند۔ غوطہ در آب خورد نظام نام آزادہ از آب کشاں لشکر۔ کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ و گوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظر عروج و اقبال خود بود) و با خویشتن وریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت ہوا خواہانہ بداں چستی کہ گوئی گوئے دولت بُرد۔ خود را آب ورزد۔ بارے بدانست آشکارا بنیاں سقائے سخت گوشے بود، و بہ والا دید معنی آشنایاں فرخ سروشے بود کہ جہانباں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبوہ

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آئے ہیں لیکن کتاب دستنبوہ میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبوہ کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

غدر کے اسباب | دریں روزگار۔ کہ ہر زمزمہ را منجار، و ہر ہمہ را رفتار، و ہر کجا سپاہے بود از سپہدار سخن پیوندی بگذارد و بگوے کہ خود روز و روزگار برگشت اختر شناسانِ سپہر پیمائے (یعنے منجماں) بر آنند کہ دراں روزگار۔ کہ بزم تازیزد جرد شہریار پارس از تدکتازِ تازیاں (اہل عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطاں) انجمن آرائے و ہنر آزمائے بودند۔ اینک ہماں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں ہم پیوستن گاہ

(جاے قران) بہرام کیوان ست و ایں شورش و پرخاش وجنگ و خواری و خونخواری، و رنگ و نیرنگ نمایۂ ظہور) آنست

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختن لشکرے دیگر بود از کشور دیگر، و ایں برگشتن لشکر ست از خداوندان لشکر: چنانکہ از داستان باستان پارسایان پارس بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو سیتیزہ آویز ہویدائی دارد۔ دراں بارکہ سخن درکیش بود۔ ایران ویران بہ فرۂ و فرہنگ کیش نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی واز ہندو آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ در ایں بارکہ گفتار در آئین ست ہندیاں بہ چشمداشت کدام آئین تازہ شادماں باشند پارسیاں رخ از آتش تافتند، و بسوے خداراہ بافتند۔ ہندیان دامن دادگراں (یعنی اہل فرنگ) از دست دادند۔ و بشکنجۂ دام ہمدمی دواں (درندگان) افتادند۔ کمی بینی کہ از دامن تا دام واز داد تا دو چہ مایۂ دوری ست، داد آنست کہ آرامش (راحت) جزدر آئین انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخم تازیانۂ تازیاں از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرہمی داشت روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت باز اندوہ از دوش دلہاے نژند (پریشان وتباہ) برمی داشت اگر در اندیشۂ راز دانان بہ ہر دانش و داد۔ ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست بسن نشان دہند، و بدول اندوہگیں بیمناک سپاس نہند جہانیاں با جہانباناں ستیزند و لشکریاں خون لشکر آرایاں ریزند۔ وانگاہ شادی ورزند، و برحویشتن نہ لرزند۔ ہاں اے دانندگانِ فرزبود (حکمت الٰہی) وشناسندگانِ زیاں وسود! این ہنگامہ بہ آتش خشم خداوند گرم ست ورنہ کارزارِ پارس اینچنیں امید سوز و آرزو گداز نہ بود۔

کیفیت شورش یافتیان در دہلی | چاشتگاہ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ دیازدہم مئی سال یکہزار وہشت صد وپنجاہ وہفت ناگرفت در و دیوار بارہ وبارد ے دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فراگرفت۔ سخن درزمیں لرز (زلزلہ) نمی رود، در آں روز جہاں سوز۔ بخت برگشتۂ وسرگشتۂ چند از سپاہِ کینہ خواہ میرٹھ بشہر درآمدند ہمہ بے آزرم وشور انگیز، و بخداوند کشتی تشنۂ خون انگریز۔ دید بانانِ دروازہ ہاے شہر کہ بروں (علاوہ) از ہمگوہری وہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش ہم سوگند نیز باشند ہم پاس نمک وہم پاس شہر گذاشتند، و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ راگرامی داشتند۔ آں سواران سرگراں سبک جلو (سبک عناں) و پیادگانِ تند خوے تیز رَو چوں در ہا باز و در باناں را مہماں نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں، و ہر کجا آرامشگاہِ آں مہماں یافتند تا زار نگشتند و پاک نہ سوختند روی ازاں سوی بنتافتند مشتے گدایانِ گوشہ گیر از بخشش انگریزی توشہ گیر کہ ناں باثرہ و دوغ می خورند و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جا بجا روزگار بسر می برند۔ (یعنی رعایاے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگاں واز غوغاے دزد تیرہ شب ہراسندگاں نہ پلارکے در دست، و نہ خدنگے در شست، اگر راست پرسی ایں مردم بہر آبادیِ کوے و برزن اند نہ براے آنکہ بہ آہنگ پیکار دامن بہ کمر زنند، با اینہمہ ازاں روکہ راہ آب تیز رو بہ خاشاک نتواں بست دست از چارہ کوتاہ دید ہر یکے در سراے خویش بماتم نشست۔ یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در خانہ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم تا از پژوہش دم زدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ برہم زدم، آوازہ بخوں غلطیدنِ صاحب اِجنٹ بہادر و قلعہ دار دارک (قلعہ) و دویدن سواراں و پیاپے رسیدن

پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندلماں ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج یا غے نبود کہ از بے برگی ماتا بدخمۂ نوبہار نشد۔ ہاے! آں جہانداراں داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکو نام دآہ ازاں خالونّاں پری چہرۂ نازک اندام بارخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام، و در یغ آں کودکاں جہان نادیدہ۔ کہ در شگفتہ روئی برلالہ و گل می خندیدند، و در خوشخرامی بر کبک و تذرو آہوی گرفتند۔ کہ ہمہ یکبار بگرداب خوں فرو رفتند اگر مرگ بر بالین ایں کشتگان بمویہ (بگریہ) خرو شد، و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست، و اگر سپہر خاک گردد و فروریزد، و زمین سراسیمہ چوں گرداز جا برخیزد بجاست۔

ای نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط — اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روی بہ سیلی کبود کن — اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

بارے چوں آں روز تیرہ بشام رسید، و گیتی تاریکتر گردید، سیہ دروناں خیروکش (بخیرگی کشندہ) ہم در شہر جا بجا رخت تن آسانی انداختند، و ہم دارک باغ خسروی را آخر اسپاں و نشیمن شاہی را خوابگاہ خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از شہرہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ (منزل) خون سپہداں ریختہ اند گروہا گروہ مردم راز سپاہی و کشاورز دل یکے گشت، و ہمہ بے آنکہ باہم سخن رود۔ دور و نزدیک یکدست بر یک کار کمر بستند، و انگاہ چساں پر زور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوش خونے کہ از کمر گذرد کشادہ نہ پذیرد۔ پنداری ایں لشکرہاے بے مرد جنگجویان بیشمار را جاروب دار کمر بندیکی ست۔ آرے رفت و روب ہند بوم بداں ساں کہ آرامش و آسایش اگر جویند باندازۂ پرگاہے گاے نیا بند ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمیخواست اینک ہزار لشکر نگری ہمہ

بے لشکر آراے آراستہ، و بسا سپاہ بینی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ و چہرہ و بارود ہمہ از خانۂ انگریز آوردہ، و با گنجینہ داراں روے بستیز آوردہ آئین نبرد و ورزش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و رخ بکین آموزگاراں افروختہ۔ دل ست سنگ و آہن نیست چرا نہ سوزد۔ چشم ست رخنۂ و روزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغ مرگ فرماندہاں باید سوخت و ہم بر ویرانی ہندوستاں باید گریست۔ شہرہاے بے شہریار پر از بندہ ہاے بے خداوند، چنانکہ باغہاے بے باغباں پُر از درختان نابرومند۔ رہزن از گیرودار آزاد و بازارگان از تمغا، خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہا (دوکانہا) خوان یغما۔

از دیباچہ ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسار ہرزہ کار را از آسمان بہ زمیں فرستادند، فرماں دادند کہ دریں بیشہ پیشہ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد۔ وایں فرازماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد۔ ناگزیرمی بایست (ضرور تھا) کمر بستن و زمیں خستن گاؤ راندن و دانہ افشاندن۔ ناداں (کشادرزی نکرد بلکہ) بہوس درزمیں غزل جاں کند، وازاں گہرہا۔ کہ باخویش آوردہ بود۔ نیمہ دراں زمیں پراگند۔ ہماناگویا) از ہر دانۂ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت۔ ازمروارید۔ کہ در خاک نہاں کنند شنیدۂ کہ ریشہ سر برزند کاش جو کاشتے۔ دانست کہ را خاک خورد (یعنی تلف شد ناچار) نیمۂ دیگر را پیش شاہاں روزگار برد دمندد پسندیدند و بخریدند۔ شبے با یکے از راز داناں پژوہش (پرسش) رفت کہ مبدأ فیاض بخل نیست، ابر بر باغ و راغ و سمن و دمن یکساں بارد،

چراست؟ کہ مردم چندے نادار دانے (چندے) توانگراند۔ گفت راست گفتی توقیع سرنوشت ہا یکے ست (یعنی یکسانست) جدا شناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست جز ایں نیست کہ کار و بار گردہے از ہر یک بریک ورق، وسوزد سازِ جرگہ (گروہے) از ہر کس بریک صفحہ نوشتہ اند۔ آنان ورق از دفتر باخویش آوردند و برات روزی از ہر در کہ مقدر بود بردند انیاں ازاں رو کہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست۔ تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند۔ گفتم از چیست؟ کہ ور چار سوے دہر۔ ع۔

بخت صلۂ مدح و قبول غزلم نیست

گفت آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردہ و ایں از انست کہ سخنہاے بلند داری، و بہ ناشناسازیاں (یعنے اجنبی زبان) حرف می زنی۔ گفتم چہ کنم تا از اندوہ بازرہم؟ گفت شکیب ورز و خوں گرمی وانچہ از شیخ علی حزیں شنیدہ می گوے ؎

کس زباں مرا نمی فہمد بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشان دادن اغلاط بربان قاطع سپاس میخواست نہ ستیز، در قلمرو ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطع قاطع بر ہانم، دگرے اخگر آورد کہ من محرق آنم کیست تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و سوختن کاغذ جز غاں دنباں چہ خیزد؟ بزہ مند (گناہگار) منم، اگر در آتش فگنند و بہ تیغ دو نیم زنند بہرد و گزند در خور ستم (یعنی لایق ہستم) و بہر دو سزا سزاوار ؛ ؛ ؛ ؛ سخندانِ راستی جوے را بایستہ آنکہ از ہر کتاب فرہنگ عبارت جامع

لہ جو کتابیں قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک کا نام قاطع قاطع اور ایک کا محرق قاطع رکھا گیا تھا ۱۲

آن را بداں نگاہ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جوہر لفظ فرو رود تا چگونگی پیوند الفاظ کہ انگیزش گاہ معنی ست آشکار شود۔ ہرگاہ آں را بہنجار اہل زبان نہ بیند۔ داند کہ در سودائے زباندانی جز زیان نبیند۔

دگراں دانند و کار آناں، مرا نیز خردے وروانے دادہ اند۔ فراز آوردۂ (پیش آوردہ) اندیشہ بیگانش را چوں پذیرم؟ واز نیروے خرد خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نبرد فزاے دانش من دانشمند کسی ست کہ اگر چنانکہ راز داں بود۔ راز گوے نیز بود۔ ششمیں ساسان[1] بشمار آید

زخویشاں بہ بیگانگی شاد نانم — نانم بکس چوں بکس مے نمانم
غریبم ولے روشناس عزیزاں — چنار سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخم افراسیابم — گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم
دل و دست تیغ آزمائی ندارم — رہ و رسم کشور کشائی ندانم
بمیدان معنی خداوند رخشم — بمضمار پہلو زباں۔ پہلوانم
دو سی سال تو قیع معنی نوشتم — سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطع برہان۔ کہ صنعت نقشبند خیال من ست لغت نامہ اعمال من ست کہ دراں جہاں بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلانے چند بفرایم و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام۔ سپس در فش کاویانی خطاب دہم۔

نازم بہ خرام کلک و طرز رقمش — مانا ست زتیزی بدم تیغ دمش

---

[1] مراد ازاں مولانا عبد الصمد استاد میرزا است ۱۲ [2] ساسان نام پسر بہمن بن اسفندیار بود کہ از بادشاہی بسیاحت و تحصیل حکمت و ریاضت پرداختہ و سہ کس از اولاد وے نیز بدیں طریق رفتہ بودہ اند و ایں ہر چہار را ساسان اول دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند من بعد پس از خسرو پرویز ساسان منجم بظہور آمدہ کہ دساتیر را از لغت زند و زبان دری ترجمہ کردہ ۱۲

چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود گردید درفش کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم - سرودن سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزونِ ہوش انگیز (سبب و باعث) ندارد - یاراں جفا کنند ومن بہ ازاے ہر جفا (بعوض ہر جفا) وفا ورزم - ہمانا نکوئی وبہی یاراں خواہم ولبس نبند نہند، پند دہم - داد دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم - سنگ زنند ثمر بارم -

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں ان میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے - ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں فقروں اور اُنکے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں - پس سوا اسکے کہ یہ نثریں شعر کے اوزان مخصوص سے جنکو اُسکی ماہیت میں کچھ دخل نہیں - معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے اُن پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے -

چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاصکر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لیئے لکھی ہیں اور ان میں اپنی نو آئین طرازی اور نادرہ سنجی کا جیسا کہ چاہیے - حق ادا کیا ہے اسلیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کیجاے عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا - جسکی وجہ سے

کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزریگا لہذا اُن نثروں میں سے صرف اسقدر انتخاب کیا جاے گا جس سے مرزا کی ان جزیل اور گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اوّل بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھکر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو نئی اور استعارے کا لباس پہناکر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں مثلاً کہ ہے پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں۔ اسکے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

اس ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں "زمینے شور کہ چوں ذوق مے در طینت زاہد۔ ہیچ گلبن را در آنجا ریشہ در خاک نہ دود۔ وخاکے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں ریگستاں بر کشند پیش از سایۂ خود بخاک اُفتد۔

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک عکس مطلب کو۔ کہ دیوان مذکور اور اسکے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی اُستاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے اس طرح ادا کرتے ہیں "بنا میزد (یعنی چشم بد دُور) نخستیں نقابے ست از روے شاہد ہر مفت کردہ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ، یعنی ننگ کشاکش دست ناکشیدہ۔ باز پسیں چراغیست از گرمی چرا غاں نیم سوختہ پہلو رُخ بافروختن دادہ، یعنی داغ منت خس نا دیدہ"

ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اسکے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "سخن آفرین خدائے گیتی آرائے را ستایم کہ تا نہانخانہ ضمیرم را از فراوانی رنگارنگ معنی بہ لعل و گہر اپاشت، باز دیم را تراز وی مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامۂ گہر پاشی ارزانی داشت۔

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیہ ناظرین باتمکین کرتے ہیں۔

از دیباچہ دیوان فارسی | دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھکر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "لائے خم میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگان۔ سگالند کہ بیچدانی را ایں مایۂ سیرابی نطق از کجا است غافل کہ نم رشحۂ یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن و نہال را سرکشیدن و میوہ را رسیدن ولب را زمزمہ آفریدن آموخت۔ و بہ پرتو مہتاب از لی ہدایت شبگیر نکردگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را ایں ہمہ روشنائی گفتار چراست، بیخبر کہ فرہ تابش یک نورست کہ شمع را بشعلہ و قدح را بہ بادہ و گل را برنگ، و دروں را بسخن برافروخت + + + + + + + + + داغم از کوتہ نظراں تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ و درخشیدن برق از شبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدن زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز و شنوا را نگارند۔ غنچہ مشکیں نفس است و باد غالیہ سائے، و گل کشادہ روے و بلبل نوا سنج، زباں چہ گناہ کردہ است کہ سخن سرائے نباشد مہر جلوہ بر تابد، و ذرہ بیتابی و بحر روانی، و قطرۂ انشتلم، دل را کہ گفتہ است

کہ از شورش ستوہ آید۔ ہمانا بدانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفاں گذشتہ را تر دماغ ساختہ، حالیا بساط بزم سخن برچیدہ وجام وسبو بر سر ہم شکستہ، وازاں قلزم رو ق کنے بر جاے نماندہ، پندارند کاش بانجمنے کہ من در فردوس ردہ (یعنی صف پائیں) بحلقہ او باش قدح می گیرم فرا رسند، تا وا رسند کہ مے فراوان ست، وساقی بیدریغ بخش پیمانہا چرعہ ریز ست ولبہا العطش گوے وللہ در من قال۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست مے ومیخانہ با مہر و نشان ست

آرائے صہباے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پر زور ست، وشب اندیشہ را بہ فردا میدان سپیدۂ سحری برات فراوانی نور ست۔ ہر آئنہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند، ومن خرابستم پشینیاں چراغاں بودہ اند، ومن آفتابستم۔

اسکے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر ومباہات پر افسوس کرکے اس طرح لکھتے ہیں" انصاف بالاے طاعت ست در ہوائے کہ بال بالا خوانی (یعنی خودستائی) زدہ ام، وورا داے کہ خود را شگرفی ستودہ ام، نیمۂ ازاں شاہد بازی ست، یعنی ہوا پرستی۔ ونیمۂ دیگر تو انگر ستائی یعنی بادخوانی بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود۔ بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے۔ وخواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگ سروری کج نشیند۔ ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیشش بندہ وار راست استے۔ شادم از آزادی کہ بسا سخن بہ ہنجار عشق بازاں گزاردستم، وواقفم از آزمندی کہ وقتے چند بگرد ار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر سبک سیر لختے بجامۂ وجنگ سر آمد، وپارۂ بہ دروغ ودریغ رفت۔ فرجام گراں خوابی بر نخاست،

وآشوب ہوسناکی فرونشست۔

از خاتمہ دیوان فارسی

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر۔ کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اسقدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اسکے چھپوانے کی نوبت پہنچی۔ اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی اسکی روک تھام میں بہت سا وقت گزر گیا۔ اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں

"ہاں و ہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش موے و مشامش بوے برنتافتے واز شموسی (سرکشی) گام بدرازی تنہادہ جز بہ پہنانہ شتافتے از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، و بہ لابۂ آواز بوسہ اش آرمیدہ داشتمے چوں پارۂ از راہ بدنیگونہ۔ کہ برشمردم۔ بریدہ شد، در وز بلند گشت، ہم جوش تندی توسن فرونشست، و ہم دست و پاے سوار از عنان درکاب خستگی پذیر آمد۔ تاب مہر نیمروز۔ مغز در سر سوار گداخت، و تفتگی ریگ بیاباں نعل در پای تنگاور نرم کرد۔ رایض رادم و کرہ را قدم بگداز آمد۔ ہم آں بہ آخر گرائید، و ہم ایں رابہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سر آمد، و در ہنگام گسستہ دمی خستگی روی آورد +++ کیست تا از من پرسد؟ واگرنا پرسیدہ گویم در دلش فرود آید، کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزشہا (یعنی جنگہا) روی دادہ و پس از آنکہ کار بدانجا رسیدہ کہ ہمدگر از کوفتگی فرومانند۔ بمیانجی گری توفیق بکدام قرارداد آشتی اتفاق افتادہ۔ خامۂ دیرجنبش بود، و شوق زودگرائے (جلد باز) گفتار ہا از نہیب دور باش اندیشہ بدرازنائے فاصلہ دل و زباں خوں شد، و اگرناگہ از دل بہ زباں رسید۔ و الا بسیچی ہمت آغاز بخامہ

نہ سپرد۔ ہر چند منش طبیعت) کہ یزدانی سرشت ست در سرآغاز نیز گزیدہ گوے و پسندیدہ جوے بود۔ اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادروی) پے جادہ نشناساں برداشتے، و کثری رفتار آناں را لغزش مستانہ انگاشتے تا ہمدراں تگاپو پیش خراماں را بجستگی ارزش ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہی خویش) کہ در من یافتند۔ مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہاے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگرستید شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ روی ہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادہ آں ہرزہ جنبش ہاے ناروا در پاے رہ پیماے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) خزرے ببازوے و لوشۂ بکمر بست، و نظیری لا اُبالی خرام بہنجار خاصۂ خودم بچالش (رفتار) آورد۔"

از دیباچۂ دیوان شفتہ] دیوان تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قوی اور اپنے تقلب ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "ہاں اے غالب تیرہ روز دژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسالی (شخصیت) کہ تراست۔ بداں مانی کہ دانی در عالم فرش محال سپندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ چہ مایۂ جوش سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسیکہ می کشی۔ چوں خطے کہ از نقطہ بر آورند ہمرنگ سویداست۔ آں قلم و اندیشہ کہ از روانی خامہ و روانی گفتار آب و ہوا داشت دے مہش را فرو ردین پرستار بود، و چاشتگہش را نسیم سحری پیشکار بدیں ناخوشی و نژندی ویراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ چمیدن دل از دست تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روی داد کہ بہ دمیدن

پردۂ شکیب نظارگیاں نہ دَرَد

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد　　زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زجنوں پردہ کشائیت کو　　ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفسِ نالہ کندت کجاست　　واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوزِ غم دود از دل برآورد، و گداز نفس آذر در زباں زد بادے کہ ہر آئینہ نگداخت، و بازبانے کہ ہمانا نسوخت، عذر غمزدگی مسموع نیست - بیا تا ہمیں دل بذرۂ الحذر نوائے را بہ سخن نہیم، و ہمیں زبانِ کژ نغمہ ایں المضرابے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظ دیوان تفتہ برنگاریم)

زمن جوئے دربد نکو زیستن　　جگر خوردن و تازہ روزیستن
سمن چیدن و در رہ انداختن　　دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہمگناں اظہار خوشحالی می کنم و اندوہ درونی را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیکس ظاہر نہ شود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں　　بہ شور آبہ شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل ربود　　نہفتن شرارے کہ در دل ربود

ستایش سخن چشم بدور - خمکدہ سخن را شرابے ست پر زور کہ زمین ازاں بہ لاے (یعنی بدر دے) و سپہر ازاں بہ بوے آنچناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرود افتد شگفت نہ نماید -

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصّہ انکے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصّے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہوسکے گا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں انکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہے اور انکی جگہ شمس الدین خاں مسند نشیں ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہونچکر خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں

میر فضل موئے خاں نام یارے داشتم، اورا ناگرفت (ناگاہ) درعرض راہ بہ مرشد آباد یافتم در نور دِ گفتگو ہائے دپرس وجو ہائے کہ رفت۔ از جامہ گذاشتن (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر بمن خبر داد وباز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند۔ آوخ! کہ چراغ روشن ایں دود مانے مُرد، و شبستان آنرو ہا تیرہ و تار شد۔ از جانب شما اندیشناکم و دانم کہ آنچہ شما را پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روزبازار خواہد بود، و فرومائیگاں را گرمی ہنگامہ زود اکہ انجمن ازہم باشد، و پراگندۂ چند گرد آیند۔ دولت روی گرداند! و آسودگی برخیزد۔ زنہار ہوشمندی را کار باید بست، و ہمواررہ بخود نگراں باید بود

ایک اور خط کو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں

جان برادر سخن را از فراوانی بر روے هم افتادن ست، وگره گردیدن
ومن آن میخواهم که اندک گویم، وسود بسیار دهد، وشنونده آن را زود
دریابد واین بسیج (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکه گوینده دران کوشد
که نبشتن از گفتن آن مایه دور تر نه رود که سرایش هر دو رشته باهم گرنتواں
تافت ونقش یکے در آئینه دیگرے نتواں یافت. زمانے گوش بمن
دارید وفرا رسید که چه میگویم، واز بیں گفتن چه میخواهم، وشما را در برابر آں
چه می باید کرد، واندازه آں بایست تا کجا ست" اسکے بعد کچھ خانگی
معاملات تحریر کیے ہیں:-

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسہ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں
اور اُنھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے
کی شکایت کی ہے انکے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارۂ بداغم زده اند　　نشتر بہ رگ صبر و فراغم زده اند
از کثرت شور عطسه مغزم ریش ست　　تا عطر چه فتنه برد ما غم زده اند

جنبش خامۂ عیسوی هنگامۂ مطاع مکرم مخدوم اعظم را نازم که باحیائے
هوس هائے مردہ ساخت خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازار رستخیز گرم کرد
غار غار دیرین آزرد ها سر از دل بدر آورد، بیاد آمد که مرا هم در گیتی
وطنے، واز مهربانان انجمنے بوده است - چوں نشتر پرسش بمغز اندیشه فرو
برده اند (یعنے احوال پرسیده اند) خونچکانی نوا ها تماشا کردنی ست درازی
زمان فراق که بگمان مخدوم شانزده سال است وبدانست نامه نگار
کم از بست سال نیست سر تیز کرده بوده است که نقش آسایش از
صفحۂ خاطر بدان سترده اند - آغاز و رود بدهلی که ورد بادۂ غفلتے به قدح

داشتم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودن جادۂ کامرانی ہوس گذشت، و یے راہمہ خوابیدہ شد۔ تا سر از مستی بگردید (یعنی بدستی سے بھر گیا) واندراں بیخودی پاے مصطبہ پیما بہ گوے فرو رفت (گرمے میں اتر گیا یعنی ایک صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم در ہم شکستہ سراپاے، دگر اندودہ سرورے، برخاستم۔ ہنگامہ دیوانگی برادر یک طرف، و غوغاے دام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب، و نگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بابے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فروبستہ۔ جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی، با خود گرفتم۔ واز ہیداد روزگار نالاں، وسینہ بردم تیغ مالاں۔ بکلکتہ رسیدم۔ فرمان دہاں سربزرگی وکو چکدلی (یعنی مہربانی وشفقت) کردند، و دل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش۔ کہ مشاہدہ رفت۔ اُمید کشایش آورد، و ذوق آوارگی وہواے بیابان مرگی۔ کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود۔ بدل نماند۔ وہوس آتشکدہ ہاے یزد و میخانہ ہاے شیراز۔ کہ دل را بسوی خود میکشید، و مرا بہ پارس میخواند۔ از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہدۂ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال در آں بقعہ مجاور بودم چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستان کرد پیشا پیش دویدم، و بہ دہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کار ساختہ شدہ۔ صورت تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں برباد دادہ، و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بروی بیگانہ و آشنا بستہ۔"

"من اگر با اینہمہ رنج واندوہ۔ کہ پارۂ ازاں باز گفتم۔ در نگارش نامہ

وسپاس پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم، و بزرگان وطن را بیاد نیارم، در عالم انصاف بزہ مند نیستم۔ اما گرانمایگان جہان مہر و وفا۔ کہ از دور افتادگان نپرسند و از مرگ و حیات دوستان باز نجویند۔ اگر گفتگو بمیان آید، و سمند شکوہ عنان بر عنان (یعنی بمقابلہ یکدگر) تاز دگوے دعوے چگونہ خواہند برد، و قطع نظر از حریف آب دندان (یعنی حریف مغلوب) کہ منم۔ خدائے توانا را چہ جواب خواہند داد "

کس از اہل وطن غمخوار من نیست مرا در دہر ہمپنداری وطن نیست

مولوی نورالحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتہ سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اسکے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اسکے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں "پدید آمد کہ خاطر عاطر را بجانب نثر گرایشے، و ہنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشی ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ آید، و ہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردی شما (یعنی کم شوقی شما) بہ تپش آموزی اپچہ دیروز (یعنی در زمانہ گزشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم۔ و خوں گرمی شما (یعنی سرگرمی شما) در خرد اندوزی آنچہ امروزمی نگرم خود را بدیں شادمی کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے برگذر دارم بداں زودی۔ کہ ثمر از شاخ افتد نخلے شدہ، و رطب بار آوردہ، لنے بہ ہنگامہ یوسفی در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید۔ از بند حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت کروہ، خواستہ آید کہ مسودہ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگرستہ و نشستہ ہر کرشمہ و انگیز ہر بذلہ را بیباکیگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحب من! مگر ندانستہ آید کہ گفتار رجز بگفتار سرہ نہ گردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود ہر چند ارادات شما ذریعۂ سعادت من و خرسندیِ شما موجب رضامندی من ست۔

لیکن تحریر دمیاں نگنجد، و بہ میانجی گری خامہ کار برنیاید۔ آرے نگارش یکدست و گفتار لخت لخت۔ ستردن یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجائے آں برنشانہ۔ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس وجود آرد۔ وحق ایں پرسش نتواں گزارد مگر بہمزبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں کہ در برادراں ازوے عزیز ترے نیست۔ سخنہاے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست۔ گرد آوردہ، وصورت سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعۂ پریشانی را پیش شما می فرستم، تا دستمایۂ سگالش در سخن و باز نمائندہ اندازۂ نکوئی فن تواند بود ++

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے (جبکہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اُس میں اُنکی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے اپنے نتائج افکار میں سے کچھ اُنکو بھیجا ہے اور اُن سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اُس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔

"ما دکانم درکشادہ بود، ورنگ رنگِ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ، کس از مشتریاں حلقہ بر در نزد، وسودائے خریداری از ہیچ دل سر بر نہ زد۔ چوں دکان را کالا، وزبان را حرفہائے جگر آلا (یعنی آلودہ بخون جگر) نماند۔ روزگار گرا نمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفےٰ خاں) پدید آورد کہ نقد رائج سخن خود را بہ بہائے گفتار ناسرۂ من می دہد، و گوہر را بہ پلہ بیعانگی خزف می نہد ++++ ہاں و ہاں اے خریدار دکانِ بے رونق! از فراوانی مسرت ورود مسعود ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ با آنکہ نکوئی خواہ خویشم۔ بر من بہ رشک، آورد۔ حوصلۂ مرا۔ کہ

فرسودۂ غماے دہرم - گنجائی ایں مایۂ شادی کو؟ واندیشۂ مرا - کہ دل شکستۂ دور باش یارانم - فرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزار خویش چگونہ پشیمان گیرمے کہ اینچنیں شادی را بخود در پذیرمے و دوستان را تا کجا قدر نا شناس پندارمے کہ از شما ایں قدر ستایش در بلاۂ خویش باور دارمے - حقا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیاناں (یعنی فصحا) و دشوار تر از انست اندازہ نمائی باندازۂ دانایاں "

"قبلہ مزد چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرق فرقداں سایے افشاندم (یعنی مجموعۂ نظم فارسی) اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست - گوئی پس از ساختن آں گنج گنجداں رفتہ، واز سخن ہر چہ ازل آوردِ من بود گفتہ شد + + + + + + + + + + + +

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشن بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے - اسکو دیکھکر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے

من کہ زبانم در ستایش بیقرار است واندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نہ شوم - و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم - بنا میزد (چشم بد دور) تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ کہ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار است و نہال نکو سرانجامی را برگ و بار - رہرو نظر چوں بہ بیدایے کنار نا پیدائے ذوق سخن گام تماشا بر دارد لوشۂ بہ ازیں بہ کمر نتواند بست - خضر آں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت - لبش بر شحۂ آبے تر نتوانست کرد، وآں آب از دریا بخشیدن بود - شما گروہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشیدید، و ایں لختے از عمر بکار دیگراں کردن ست - جاوداں

زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ وہمگناں را بہ نکوئی نام برآمد بارے گہر نہ سفتن خامہ و گوہر ہیں نہ گشتن نامہ در ردیف الف بہ نگارش اشعار پرویں نثار حضرت آزردہ[1] از چہ دوست؟ ہر چند ذکر خام بزمیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد۔ لیکن اگر بمقتضائے فرط محبت جرأتے بکار می رفت گناہے نہ بود، و در تلافی آں بہ پوزش نیاز نمی افتاد۔"

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جبکہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیجدیجئے۔ اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"دردمند نواز! نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچہ ایں راز را پردہ کشائے و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد۔ کہ روزگار بہ کزلک مدطول زمان فراق نقش بے اعتباری ہائے من از صفحہ خاطر احباب نہ سترده و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساری ہائے مرا از یاد عزیزاں نبردہ است"

در معرض طلب نثر فرو ماندہ ترازاں میزبان بے دستگاہم کہ ناگرفتہ (یعنی چانک) مہمانے عزیزش از راہ دور در رسد، و بیچارہ بساگرد سرایائے سرمایۂ خویشتن بگردد۔ تا شوربائے دو دیگے و نان کشکینے (یعنی نان جوں) فراز آرد۔ من و ایمان من کہ بگرد آوردن نثر پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نیفتادہ ام۔ چہ پیدا ست کہ فرو ریختۂ کلک ایں کس (یعنی من) نقشے ست نژند، (یعنی زشت) یا رقمی ست فرہمند (یعنی خوب)

---

[1] اقبل مسعود سے یہ مفتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو نواب صاحب نے انکا بھی تذکرہ درج کر دیا ۱۲

درصورت اوّل چہ لازم ست خود را بہ ہیچ فروختن و وبالِ نظارۂ آیندگان بہ سلم خریدن، و در شقِ ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگان چہ بردہ اند و گذشتگان چہ یافتہ کہ مارا از روے آں وایہ (یعنی دریوزہ) بیتاب دارد۔ انصاف بالاے طاعت ست۔ بدعوی گاہے کہ توانائی قتیل را بفروہیدگی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش) مسلّم داشتہ ولوے نورالعین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز) برافراشتہ باشند۔ باید گفت کہ نتائج طبعِ ماکجائی ست ومارا چہ لذت دریں جگر خائی ست سطرے چند دیباچگی دیوان ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سودائے کہ بہ آرایش سفینۂ موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان فرستم و از شرم تنگ مائگی آب میگردم۔ والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اُسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "دریں ہنگام کہ فرومانگی از اندازہ گذشتہ و دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است۔ ندانم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگرستن نگہ از ناز بدیدہ درمنی گنجد، و دریں نگارش نامہ از شادی در بنان (سر انگشت) می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستایم و پندارم کہ بطور معنی رسیدہ ام۔ خود را بگراں مائگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را باید بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم مرا بگرفتن عیار ایں دعوی حیرتے روے دہد، و ایں مایہ بالا خوانی و خود نمائی از من عجب آید۔ گویم ہاں انصاف، سخن بکنایہ می سرایم نہ بگزاف۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی کرمی میر موسیٰ جان ست، و ید بیضا عبارت از دیوان فرد غانی عنوان۔ ترہے دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغ طور ست۔ و غلافش از دیباے

جملہ حور قلزم معنی را سفینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ ۔ + + + سبحان اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بہ پایہ بلند رسید، و اُردو دار و نق دیگر پدید آمد اینکہ نامہ من بخاطر عاطر جاے گرفت، و فحکوۂ آں بہ زبانِ قلم رفت، مرا آبرو افزود۔ وارزشِ مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں چشم و دلم جاے باشد، وچوں نامۂ من نہ رسد بآرزو ارزد۔ گرد سرایں نوازش گردم، وبریں پرسش جاں برافشانم + + + + +

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ خط موسومہ لالہ ہیرا لال کے معلوم ہوئی ہے اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں۔

قبلہ وکعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرا لال را ہوائے دیدن عنقا در سر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمن تنہائی من گذر افتادے۔ آں در گرفتنِ آتش گرد اگرد والا کاشانہ و سوختن خانہ و رخت ہمسایگاں از ہر کرانہ، و نہ رسیدن آسیبے بملازمان در آں میانہ، از کجا شنودمے واگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حق دوستانہ پرسش۔ کہ شیوۂ غمخواری دانندۂ ربائی است۔ ناگزاردہ ماندے، وہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی وسپاسگزاری است بتقدیم نرسیدے! ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرا لال) کامیاب پیام ونامہ وآشنایان جگر تشنۂ رشحۂ خامہ

وائے برمن کہ رقیب از تو بمن نماید نامۂ وا شدۂ مہر بہ عنواں زدۂ

ہما نا آں سوزندۂ آذر سرگرمی شوق ازمن فراگرفتہ بود کہ بیتابانہ گرد سرگردید، واندراں اشتلم (شدت) زبانہ وشرارہ در خویشتن نگہداشت ہیہات من کجا واین ہمہ دعوی بلند از کجا! خود نمائیہا گمان تاثیر مہر وفاست

کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لائے و یافہ سرائے دارد، ورنہ آنراکہ از شعلۂ آہ جگر سوختگاں دامن نہ سوزد، عجب نیست اگر آتش افروختہ پیرامن نہ سوزد۔ شکوۂ پیشکش، و پیغارہ (طعنہ) برطرف، خدائے توانا را شکر گویم کہ بلائے بے زینہار از بندگان خویش بگرداند، و تابے بصراں را دیدہ وراں را سرمہ بدست افتد۔ کرشمۂ نیروئے جبریلؑ و معجزہ آسودگی خلیل را در نظرہا تازہ کرد + + + اگر دانستے کہ پیش خود شرمساری نخواہم کشید، و مرا اندریں محال طلبی برمن زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عنایت پاسخ ایں نامہ و تفصیل ایں ہنگامہ درخواستے و پرسیدے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، و نگہ بسراغ تیرگی دودے و تابش نمودے فرارسید۔ شما چہ می کردید؟ و نور چشم مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس از انکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد و ہژاہژ در انجمن افتاد۔ سراسیمگی درونی پرستاران و بیتابی برونی ہواداراں چہ قیامت آوردہ؟ و اینہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ و فرجام کار کہ مژدہ ایمنی دادند۔ برکار خانۂ دواب و بنہ و بارکہاراں (یعنی اسباب ایشاں) کہ اینہا را جز بہ اطراف کاشانۂ محل نیست، و بیشتر از ینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینۂ (ایندھن) آتش ست۔ چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزش التفات از من سلب کردہ، و مرا نیک در دل فرود آوردہ اند کہ حالیاں دراں گوشۂ خاطرم جائے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ آم بطریق آرزو نہ بہ سبیل سوال۔ والسّلام

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اسکے اول اور آخر کے فقرے یہ ہیں۔

سحرگاہے کہ دلم از دردشانہ چنانکہ مومن[۵] مہر پیشہ از رنج ہمسایہ درآزار باشد - بیقرار بود، و دستم از اشتغلم بیتابی دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے دردآمد، و سپردنِ بہار سامان نامہ گل بہ جیب تمنا ریخت - ہرچند نامہ سیاہ مس امید را کیمیا، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارکِ اقبال را افسر، و پیکر آرزو را زیور بخشید لیکن از انجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شعر و غزل - چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکرے و شاہد - سادہ بود دل سودا زدہ بداں نیاسود، و خمارم بداں کید و جرعۂ صہبا نشکست گفتم ہے ہے نہ مژدہ دیدارے کہ دل بہ نشاط آں تواں بستن، و نہ کرشمہ غزلے کہ لب بہ زمزمۂ آں تواں کشودن + + + + + امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر بانشای غزل شادم فرمایند، و نوید رو بکوتاہی نہادنِ روزِ فراق کہ اندریں موسم کہ خسرو انجم بہ اسدؔ جاے دارد عجب نیست بفرستند دولت و اقبال روز افزوں باد

جواب نامہ شیخ امیر اللہ سرورؔ تخلص رسیدن دلنواز نامہ دل آرزومند و شاخ آرزو را بر و مند ساخت - گلہ از نارسیدن پاسخ نامہ ہاے خویش مکنید، و از خدا شرم ندارید - من خود از جانب شما نگرانی داشتم کہ کجا ئید؟ و چہ در سر دارید؟ بارے پردہ از روے کار شما بر گرفتم، و دانستم کہ یک چند مرا فرموش کردہ بودید، ناگاہ ورود جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ اُفتاد، شنیدید کہ فلانی (یعنی غالب) از سخت

---

[۵] دل کو مومن سے اور شانہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے ۱۲ [۵] یہ خط مرزا نے اسوقت لکھا ہے جبکہ آفتاب برج اسد میں تھا چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور انکے نام کا جزو ہے اسلیے آفتاب کے برج اسد میں ہونے سے یہ فقرہ لیا ہے ایسے وقت میں آپ کا مجھ سے ملنا کچھ دور نہیں ہے ۱۲ -

جانی ہنوز زندہ است، مہر کہن بجنبید، خواستید کہ بنامہ یاد آوردید از فراموشی روزگار گذشتہ اندیشہ کردید، لاجرم دروغے چند برہم یافتید وآں را دیباچۂ دیباچہ نامہ ساختید۔ از حالِ من پرسیدہ اید۔ چہ گویم کہ بلفظ نیرزد۔ چنانکہ گفتہ اند۔

شکستہ دل ترازاں ساغر بلورنیم کہ درمیانۂ خاراکنی ز دُور رہا

خیرہ سر، وآشفتہ رائے، نہ زباں سخن سرائے، ونہ دل از سراسیمگی برجائے۔ چہار سال میگذرد کہ مقدمۂ من با جلاس کونسل درپیش ست، ودلم از تفرقۂ بیم وامید ریش۔ حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد برنیامدہ، وہنگام بہ پایاں رسیدن تیرۂ شب نا اُمیدی درنیامدہ حالیا براں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بیٹنک بہادر بدیں دیار در آید بدامنش در آویزم، وداد خواہم، واستدعاے صدورِ حکم اخیر کنم گروہے برآنند کہ نواب عالیجناب بہ دہلی نخواہد آمد، وہم ازاں رہگذر ہا بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنیں ست بدامن وروزگار من، وآوخ از دوری راہ ودرازی کار من۔

خواستہ آید کہ نتائج طبع والاے شما بنگرم واز تراویدہ ہاے کام و زبانِ خود بشمار مغانی فرستم۔ فرصتِ آں کجا؟ ودماغ ایں کو؟ آمد آمد نواب گورنر، ودریوزۂ اخبار از ہر در ترتیبِ افراد مقدمہ، وتمہید نگارش حال سنجیدن اندیشہ ہاے رنگارنگ اوسگالیدنِ اندازۂ بیان آں مایۂ دستیاری وغمخواری از کسے چشم نہ دارم کہ چوں ورقے انشاکردۂ باشم نقل آں تواند برداشت یا چوں دفترے از بہر نگریستن پریشاں کنم آں اوراق پراگندہ را فراہم تواند کرد بہر رنگ چند روز دگر معاف دارید، وتا زمانیکہ بمن پیوندید گاہ گاہ بہ نامہ رنگ

زدائے آئینہ و داد باشد۔

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں انکو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیس فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں مخدوم غالب! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے۔ من دانم و دل کہ در شکوہ چہ وش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے۔ صرفہ شما (یعنی سود شما) در ناکامی من ست (جسکے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تاب و تواں داشتمے آں قدر با شما در آویختمے کہ شمارا دامن و گریباں بزیاں رفتے۔ و مرا سرور و شکستے۔ آخراز خدا بترسید، و از رویداد بسنجید کہ کار من و شما بداں رسد کہ روز ہا بگذرد و بہ نامہ یاد نگردم گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بند گزارش اندوہے تازہ ام شکوہ کجا بخاطر ناشاد می رسد اگرچہ اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز نہ بود۔ لیکن اندیشہ بداں پیچید کہ مبادا دوست ادا نہ شناس من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاوید گستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعائے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موج بلا کہ زورِ قہم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروزپور) خانہ بسیلاب فنا داد۔ خونِ دفائم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم۔ و اماندگی و بیچارگی من ازینجا

توآں سنجید کہ دندان بر جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا گذارم اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نظلم نشاند، و بہ تیغ بیدریغ خونم ریزد، سزاوارم و لطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامہ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید، مگر سراج الدین احمد بتلافی برخیزد و تا از گرانی تشویر (شرمندگی) سبکدوش کردم، و گرد خجلت از چہرہ برافشانم - یعنی کمر بہ غمخواری و رہبر و نوازی استوار بندید، و خود را دوست دیرینہ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمند دور از خانماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیاہ را فرامش کند، و شمارا بجای او داند - و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شمارا دریابد - دانذکہ اسد اللہ پیش از وبہ کلکتہ رسیدہ است - قطع نظر ازیں مدارج کہ بر شمردم - آخر خدائے ہست و دادے ہست - افسانہ ناکامی و ستم کشیِ ایں فروغ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند -

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں

گوہر آگیں نامہ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید نارسیدن نامہ مرا بافسردگی شوقم حمل کردید، چرا بمرگ من حمل نہ کردید؟ تا از ادا شناسی ہائے شما خرسند بودمے و شمارا اہل دل و دانشور شمردمے - من و ایمان من کہ ریشۂ مہر شما بہ مغز دل دویدہ و محبت شما با جان در آمیختہ - تا زندہ ام، بندہ ام - وفا آئین من ست و مودب دین من ست اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمل نہ شود - دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر و تفرقہ ہا در خاطر، و سواد

درسر چہ گویم چہ می کنم ورور و شب چگونہ بسر می برم + + + +

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب فارن سکریٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں "عمر من و جان من! پس از رسیدن گرامی نامہ دربند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجرائے خود شرح دہم ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعہ مکارم اخلاق راشیرازۂ وجود از ہم گسیخت، شمع ایوان سروری مُرد و نہال باغ آگہی را برگ و بار فرو ریخت۔ دستگیر درماندگاں راد ست از کار رفت و گرد کشای بستہ کاراں رائے بناخن شکست۔ خاکم بدہن چگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند؟ کہ مستر اندرو استرلنگ مرد، و از گیتی جز نام نیک با خود نبرد۔ کاش روے گداختہ (مچھلی ہولی کانسی) بروز نہ گوشم ریختندے تا نہ شنودمے کہ چہ شد۔ اکنوں امید غمخواری از کہ بایدم داشت و دل را بخیال گردش چشم کہ تسکین داد۔ رپورٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر خصوص داد خواہی من بہ صدر فرستادہ است۔ چہ گویم کہ چہ امید گاہ واندوہ فزائے بودہ است بر کارسازی آں چابک خرام بیدائے فنا (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں از شش سو فلک بکام دشمن ست زینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روی داد، و آں گلبن روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، و پس از روی سرانجام دفتر کردہ چہ شد و جایش کہ گرفت۔ اللہ بس ماسوی ہوس۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "والا نامہ رسید و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید چہ مایہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت

دوست انشا میکنم و اجزاے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم وعدہ فراموش بیمروت راہ گرداند، و تا قبہ بسر منزل دیگر راند گر فتم کہ خاطر دوستان عزیز نداشت۔ چرا بحال خورد سالان خود نپرداخت و سایہ از سر شاں باز گرفت۔ و اے بے یاری یاراں وے، و دریغا بے پدری پسراں وے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستن تار و پود پندار ہستی را چارہ نہ تواں کرد۔ لیکن انصاف بالاے طاعت است، ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نہ بود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے، و روے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدے۔ چرا آں مایہ در رنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کار ہا باندازہ دانش وے روان گشتے، حیف کہ مہیں پسرش خرد مند ست و باشد کہ بہ حقیقت سرمایہ پدر دانا، و بگرد آوردن زر ہاے پراگندہ تواناد نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ جنگ آرد بیاد دہد، و بر فر دوستاں خود ستم کند، و کہیں برادراں ناکام گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال اسپنے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید و غمخواری بے پدر ماندگاں نماید بند در من قال ؎

مرا باشد از درد طفلاں خبر کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ یتیماں بیچارگاں عین فرض و فرض عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابو القاسم خان بیکسی ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں "زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدین! تو سر از خداے جہاں آفریں کہ چون قیامت قائم گردد او آفریدگار نشیند،

من گریاں وموبہ کناں دراں ہنگام آیم، ودر تو آویزم، وگویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت ودلم برد، وچوں من از سادگی بروفائکیہ لردم، وایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش کج باخت وبمن بیوفائی کرد خدارا بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ وچہ عذر پیش خواہی آورد؟ اے بر من کہ روزگار ہا گذرد وخبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست وچہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر توانی بیفزائے کہ اینجا مہر ووفا فراوان ست، لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد واگر خود ایں تغافل بہ باد افراہ یعنی (بپاداش) جرمے دیگر ست نخست گناہ را خاطر نشاں باید کرد، وانگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیان نگنجد و مرا زہرہ گفتار نباشد۔ منم کہ معاش من از گونہ گوں رنج ورنگ رنگ عذاب بمعاد کفار ماند، خون در جگر وآتش در دل وخار در پیراہن و خاک بر سر۔ ہیچ کافر بدیں روزگار گرفتار مباد، وہیچ دشمن ایں خواری نبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرا پایش بگل فرو رود، وہر چند خواہد کہ بالا جہد نتواند وفرود تر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر کہ گیتی را برویش دیدمے، ووصالش را زندگی دانستے بکلکتہ رہگرا شد دیگر زندگی از بہر کہ خواہم ودل را بدیدار کہ شاد ماں دارم۔ واماندگی من از اینجا تواں سنجید کہ نتوانستم ہمپائیش کردن وروا داشتم اورا تنہا گذاشتن۔†

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں "کار من بدادگاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ امان دہد باز بداں در (یعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم ودر دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغان ہوا وماہیان دریا را بر خود گریانم۔

ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ بہم بدین تفریق از روے دفتر سرکار ثابت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش رانندے وگفتندے کہ ہر زہ مخروش، آنچہ تو باز یافت وانمودہ یافتنی ازاں افزوں تر نیست او قرارداد نیز ہماں ست لاجرم دیوانہ بودمے اگر بدیں کشور باز آمدے، و بایک قبیلہ (یعنی باجمعے کثیر) کہ خویشان و برادران من اند- بہ ستیزہ برخاستے - و بہ باطل ستیزی نام برآوردمے + + + + + + + + +

چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت - خدارا بنگر، و بہ دردِ دل من وارس - کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک برمن مہربان شود و پوستے کہ خوشتر ازاں نتوان اندیشید بصدر فرستد، وجوابے - کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید - از صدر حاصل نماید، ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد - و ہاکنس کہ بجاے کولبرگ نشیند - آنچہ برہم زدن ہنگامہ سلطنتے را بس باشد - از بہر من بصدر نویسد، و من دراں داوری (معاملہ) از مستر استرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم، ہنوز آں رپورٹ بصدر نہ رسیدہ باشد کہ مستر استرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد - چوں از ہمہ بگسلم وبدامن جارج سوئینٹن بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل جہان بانی افشاند - سبحان اللہ! معزول نگردد مگر کولبرگ، بمرگ ناگاہ نمیرد مگر استرلنگ - بولایت نہ رود مگر جارج سوئینٹن، در خوراں صدمہاے جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ + + + + + + + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط "دلنواز نامہ پس از عمرے رسید، وعمرے دیگر بخشید، تا عمر باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد- اما شاد کردن دلے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آسان ست - منم کہ

چوں نامہ شما رسیدے مستانہ از جاے برجستے، و بہماں جہاں نشاط اندوختے اینک تا چشم بہ سواد ایں صحیفہ دو چار شد گیتی در نظرم تیرہ و تار شد نخست انچہ بنظر در آمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خون کرد۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما ہے ہے! مخدومہ مرحومہ ہمان ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنود بود دید دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فرو گرفتہ درنظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد توانا ایزد پاک شما را شکیب عطا فرماید۔ و تنومندیِ دل و توفیق ثبات ارزانی دارد و ایں سانحہ را در روزنامۂ عمر شما خاتمہ مکارہ و مقطع مقاصد گرداند،

آشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقۂ تازہ خوشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشافِ این معنی غبار ملال بر دل فرو ریخت۔ خدارا دلتنگ نتوان شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت شارستانے (معمورہ) بدین تازگی در گیتی کجاست۔ خاک نشینی آن دریا را از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر من و خدا کہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوق ناموس عیال بگردن نداشتمے دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستے دراں میںوکدہ بودمے، و از رنج ہواہاے ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہاے سرد، و خوشا آبہاے گوارا۔ فرخا بادہ ہاے ناب و خرما ثمرہاے پیش رس

ہمہ گر میوۂ فردوس نخوانت باشد غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعہ کا قطعہ تاریخ لکھکر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستایش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔

جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے تو اسکا شکریہ اور ایک وضیر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے" گمنامے را نامور ساختن، و ہیچے را ہمہ پنداشتن عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ۔ خاصتہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، وآں بزرگ مرحمتے بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگزندہ اگر دیدۂ حق بین دارد۔ بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ، اجزائے ممکنہ را۔ کہ درکتم عدم متواری بودہ اند۔ بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ و بران معدومات منت ننہادہ۔ حقا اگر تاملے بسزا کردہ شود۔ رقم گشتن قطعہ تاریخ در آئینہ سکندر ازیں عالم خبر میدہد۔ وچون ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روائی خواہش را چگونہ چشم نتواں داشت۔ لاجرم در گزارش مدعا فصلے بمیان نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود۔

نہفتہ مباد کہ قدر نشناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر والمعنی یگانہ مولوی فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وارہاند۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم وفضل و دانش وکنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماندہ، و بازاں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجیدہ، ہنوز ایں عہدۂ دون مرتبہ وی خواہد بود بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خان (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارف خدام مخدومی معین کردہ نزد خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر مولانا را۔ تا پدرود کند۔ سوے خود طلبید، ودوشالۂ ملبوس خاص بدوش وے نہاد، وآب در دیدہ گرداند، وفرمود کہ ہرگاہ شما می گویید کہ من رخصت می شوم۔ مرا جز اینکہ بپذیرم۔ گریز نیست۔ اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع

از دل بہ زبان نمیرسد الّا بصد جرثقیل تا اینجا سخن ولیعہد بہادرست۔ غالب مستہام از شما می خواہد کہ واقعہ تودیع مولوی فضل حق، واندوہ ناکی ولیعہد بہادر، وبدرۂ آمدن دلہاے اہل شہر، بعبارتے روشن وبیانے دلآویز در آئینہ سکندر بقالب طبع در آرید، و مرا درین تفقد منت پذیر انگارید۔

والسّلام۔

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں کہ جس سے انکے مفصل حالات معلوم ہوں نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کیلیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

ہر نسیمے کز کوے تو بخاکم گذرد یادم از ولولۂ عہد سبکتا ز دہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برد، و جان بخشید۔ اگرچہ آں جان ہمن نماند، وہم بر سر آں نامہ بہ فشاندن رفت، لیکن سپاس دلربائی وجاں بخشی باقی ست۔ امید کہ تا جان بخشیدۂ یزدان در تن ست گزاردہ آید۔

مخدوم من در رسیدن نامۂ پیشین دو دل (متردد) چرا ست؟ ہنوزم نشاط ورود آں نمیقہ در دل، و سواد سطور آں صحیفہ در نظر جادارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامہ پیشین) کہ غالب خویشتن لختے از رسم وراہ سترگان پارس برگوید، وکتابے ازاں گروہ نشاں دہد کہ ازان دیرین کیش، وہمسازاں باستانی زبان۔ ازاں اوراق تواں یافت، لاجرم دانش من (علم من) اندازہ سرانجام پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد) چوں دوبارہ گفتند کہ خواہش چنین ست۔ ناچار مہر خموشی ازدہان و پردۂ شرم

نادانی از میان برداشته میگویم که روائی این خواهش از هیچکس چشم نتوان داشت، و خود را به بند این پژوهش (تلاش) خسته نتوان کرد - نگارندهٔ دبستان مذاهب با اینهمه لاف آشنا روئی (واقفیت) انچه می گوید نه همه است و نه همه برجاے خودست (یعنی نه مکمل ست و نه سراپا صحیح ست) پارسیانیکه در سورت و بمبئی آشیان دارند - زینهار گمان نبری که ازان گروه (یعنی از ستر گان پارس) جز نام نشان دارند - آن پویهٔ وآن هنجار (یعنی آن روش وآن طریق) وآن نگارش وآن گفتار ندانند، و جز تخمهٔ ونژاد از روے شیوه بپارسیان نمانند - پارسیان از گرانمایگان روزگار، و برگزیدگان دادار بوده اند، و به روزگار فرمان روائی خویش دانشهاے سودمند (علوم مفیده) وکنشهاے خرد پسند (اخلاق پسندیده) داشتند - کشایش راز خرامش هفت سپهر، ونمایش اندازه گردش ماه ومهر، پدید آوردن رخشنده گهرها از تهٔ خاک، و بدر کشیدن بادها و آب از رگ تاک پژوهش اسباب خستگی و رنجوری، وگزارش احکام پزشکی (طبابت) وچاره گری، پرده کشائی فهرست اسرار کیانی (سلطنت) و فرماندهی، و رصد بندی تقویم آثار بندگی و فرمانبری، عنوان بیک دگر بستن رنگ رنگ گهرها، و هنجار سره کردن گونه گون هنرها، دارد گیاها فراخور هر دو بکار اندر آوردن، و پرندگان هوا و درندگان دشت را به شکار اندر آوردن، کوتاهی سخن والالی اندازهر گونه بنیش، و پیدائی اندازهٔ کمال آفرینش، همه در آئینهٔ اندیشهٔ این فرزانگان روی نموده - وانگیزش بایستگی گفتار وکردار که اکنون به اند کے ازان بسیار نازند - از مغز دانش این فرهنگیان بوده است گنجینهٔ خسروان پارس راز هر علم دفترے

بود، و ہر دفتہ از گراں مایگی گنج گوہرے - چوں دولت ازاں طائفہ رومی برتافت، و سکندر ابن فیلقوس برایران دست یافت کتب خاصہ خسروی بتاراج رفت - اما آنچہ پراگندہ بود و گناماں بہر گوشہ و کنار داشتند - بر جا ماند - تا بہ روزگار پیروزی تازیاں دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمد - (فراہم آمد) و بر فرمان خلیفہ - افروزندۂ گلخن گرما بہاے (حمام ہاے) بغداد شد - ہمانا احکام آذر پرستی ہم بہ آزر بازگشت - زبان آوران عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازہ برانگیختند تا بداں زبان کہن سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آئیں براستی خبر تواند داد - پژوہندۂ ایں راز را کام دل برنیاید، و من ضامن کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فراہم آرد - نہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد -

دیگر آنچہ کلک مشکبار بداں رفتہ کہ منتخبے از گفتار نارواے خود برنگارم و لختے از ماجراے خود برگزارم - اندیشہ را بہ لب گزیدن و خرد را بشگفت راز (در محل تعجب) افگند -

چگویم از دل و جانے کہ در بساط من ست ستم رسیدہ یکے نا امیدوار یکے

از چہ بداں ارزم و مرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگان مرا ستایند، و گفتار مرا در تذکرۂ شعرا جا دہند از فرجام فرہمندی ہستی (یعنی ازشان وشکوہ ہستی) و سر و برگ پیدائی - کہ نزد آشکارا بنیان زود زوال، و بوالا دید یکتا گزینان (یعنی قائلان وحدت وجود) نمود بے بود ست آنچہ بمن دادہ اند زیانے ست یافہ سراے و خامہ ایست بیہودہ پوے - من ہم از بے مایگی چوں کودکان کہ درم از سفال سازند و

بہ گنجینہ داری نازند۔ سرودۂ زبان و پیمودۂ خامہ را (یعنی کلام خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ۔ بگمان نام آوری کہ دل از تاب اندوہ ناروائی آں خون ست۔ دیوانے ترتیب دادہ جا بجا بنظرگاہ التفات یاراں فرستادہ ام بزرگانے کہ بہ پرسش غالب مستمند روے آرند۔ سواد ہر غزلے کہ خواہند ازاں اوراق بردارند، کہ انتخاب و التقاطِ اشعار حوالہ بہ رائے نامہ گرد آور (یعنی مولف تذکرہ) است، نہ باشارۂ و ایماے سخنور + + + + اما اگر گزارش حال سخنور ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند سخن را در ستایش من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا، و گبر بیست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص می کند و بدیں رنگ ژاژ می نماید۔

خرسندیِ غالب نبود زینہمہ گفتن یک بار بفرماے کہ اے ہیچکس ما

پنہاں نماند کہ در اصل آفرینش از دودۂ روز فرو رفتگاں، و حلقۂ بخت برگشتگاں۔ ستم رسیدۂ دروے بہی نادیدہ کسم، آرایش سخن پیشہ کش (یعنی برطرف) ترک نژادم، و نسب من با فراسیاب و پشنگ می پیوندد۔ بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم گوہری داشتند، و بعہد دولت اینان رایت سروری سپہبدی افراشتند۔ بعد سپہری شدن روزگار جاہ مندیِ آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چو ناروائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد۔ جمعے را ذوق رہزنی و غارتگری از جاے بردہ، و طائفۂ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاکانِ مرا بہ توراں زمیں۔ شہر سمرقند آرامشگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد،

وبه لاہور ہمراہی معین الملک گزید، چوں بساط دولت معین الملک
درنوشتند، بدہلی آمد، وباذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست
زاں پس بدم عبداللہ بیگ خاں بشاہجہاں آباد بجود آمد، ومن بہ اکبرآباد
چوں پنج سال از عمر من گذشت - پدراز سرم سایہ برگرفت - عم من
نصراللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد - ناگاہ مرگش فراز
آمد - کما بیش پنج سال پس از گذشتن برادر پے مہین برادر برداشت
ومرا دریں خرابہ جاتنہا گذاشت - وایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی
وگردوں را کمینہ بازی بود در سال ہزار وہشت صد وشش عیسوی
بہنگام ہنگامۂ لشکر آرائی وکشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک
بہادر بروے کار آمد - چوں عم مرحوم از دولتیان دولت ابل فرنگ
وبا انبوہی چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ، باسرکشاں سرگرم جنگ
بود، وہم از بخشش ہاے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از
مضافات اکبرآباد بہ جاگیر داشت - سپہ سالار سرکار انگلشیہ بہ
خونبہاے آفتاب (یعنی نصراللہ بیگ خاں) کلبۂ تارگدایاں را
چراغ، وماہنوایاں را بعوض جاگیر بمشاہرۂ از خار خار بستجوے وجہ
معاش فراغ بخشید - تا امروز - کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ
چل وچار میرسد - بداں راتبہ خرسندم، وبداں مایہ قانع درسخن ازپرورش
یافتگانِ مبدا فیاضم، وسوادِ معنی را بفروغ گوہر خویش روشن کردہ ام
از بیچ آفریدہ حق آموز گاریم بگردن، وبار منت رہنمائیم بردوش نیست -

غالب بہ گہر زدودۂ زاد شمم — زاں رو بصفائی دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم جنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

نامہ بہ پایاں رسید، وشرم پراگندہ گوئی و دراز نفسی برمن آشکارا کردید، وران دانند کہ گفتنی فراواں بود، و افسانہ پریشان، تا کجا اندک گفتمے، وگفتار را از درازی نگاہداشتمے۔ مرا در اینچہ رفت گناہے نیست۔ واگر خود گناہ ست، دوست کریم ست وکرم عذر خواہ۔ والسّلام۔

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے میں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اسکی جبلت میں ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں" ایکہ گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کارآگاہانہ میگزارد۔ با ایں ہمہ اندر وہناکی خندہ ام درگرفت، وعنان ضبط خویش از کفم بدر رفت۔ ندانی کہ پراسپان بادرفتار برنشستن، وگروہا گردہ مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباس رنگارنگ برآراستن ومعدہ را بہ الوان خورذیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن وغبار معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید وپزشکان را نشاید کار دانشوراں چیست؟ دور از آبادی دربن کوہے نشستن، واز نشش جہت در بروے خلائق بستن، تن را بہ ریاضت فرسودن، وجان را بہ بخردی پالودن۔ ہر کہ حکیم خردگزیں ست کار وبارش ایں ست۔ بے برگ ونوائے از شکنجۂ گوناگون حسرت بدرستہ بہ فراخ نائے سرخوشی (مستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رود وبا بطبیع کریم بود۔ ہنوز ذعیۂ منی از ریاح غلیظہ صالحۂ کبدیہ ممتلی دارد، ہر آئینہ بفرمان بادست روزے چند باش تا بنگری گرہ برکیسۂ زر زناں، و در حسرت زر تلف کردہ زاری کناں ایں کہ فلاں وبہماں را از نزد خویشتن راندہ است۔

حقا که روے در مضلقے نداشت ، و هر چه کرد از بخردی و اہلی کرد - چه اگر دانا بودے ، و خرد داشتے - آناں کہ راندہ است نہ راندے ، و کارہا از آناں گرفتے - و اینناں راکہ با خود در یک پیرہن جا دادہ ست - چوں غبار از دامن افشاندے ، و هرگز به هواے اینناں نرفتے - کودکی و بیجا صلی درزید ، مگر در ایام صاحبزادگی و ولیعهدی از آناں دلے پرداشت ، و با اینناں لختے رام بود - از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن ، و در دام اینناں بدیں کوری در آمدن نہ بفرمان دانش ست نہ بفرمان بینش ، حکیم کرا میگوئی ؟ پیشہ کرا میخوانی + + + چوں سخن دریں باب بسیار ست نامہ بہ دعا ختم می کنم - دیدہ را بینشے و دل را دانشے سودمند روزی باد -

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جنسے مرزا باندے میں مل کر کلکتے روانہ ہوے ہیں کلکتے میں پہنچکر ان کو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اسکے آخر میں لکھتے ہیں روز سہ شنبہ چارم شعبان پارۂ از روز بر آمدہ در کلکتہ رسید - غریب نوازیہاے وہاب بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانۂ چنانکہ باید ، و هرگونہ آسایش را بکار آید ، ہم اورا باندازۂ فراغ خاطر آزادگاں قضاے دہم اندرومانند و ہان آزدنیا طلباں بیت الخلاے درگوشۂ صحن پراز آب شیریں چاہے و برطرف بام درخور اہل تنعم آرامگاہے بے آنکہ جستجوے رود ، یا گفتگوے شود - بے منت و بے زحمت بکرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید ، و آدم و چاردا راتکیہ گاہ آرامش گردید - دو روز از رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علی خاں) راہ مدعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگ ہگلی بندر کردم -

لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد۔ رواست، واگر گویم کہ مرا بر من بر شک آورد و نیز جا دارد بخدائیکہ خرد آفریدہ دو خرد ور برگزیدہ۔ بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگالہ نخواہد بود۔ یارب ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامی دودماں بارے چوں تحسیں صحبت بود۔ بچارہ جوئی و مصلحت پرسی دمے سر نہادم، و دو سہ ساعت نشستہ بقمکدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکام ہنگلی در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ در پیش و دل سر گرم فکر کار خویش ست۔ ولہ در القائل۔

ہمہ را ماتمِ حسرتِ دنیا دیدم چوں بعشرت کدہ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں "از نوادر حالات اینکہ سخنوران و نکتہ رسان ایں بقعہ پس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یکشنبہ نخستیں سخنگویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندند ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، و اشعارِ مرا شنودہ ببانگِ بلند می ستاید، و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتون خود ستائی ست۔ ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگان فن بردد بیت من اعتراضِ نادرست برآوردہ آزا شہرت میدہند۔ و بے آنکہ مرا زباں

بپاسخ آشنا شود - از دانشوران - کہ مخدومی و ملازمی نواب علی اکبر خان و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از انانند - جوابہا می یابند، و پس زانوے خموشی می نشینند - چنانچہ ہم بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوی انشا کردہ ام، و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش جوابہاے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ، وآں مثنوی (یعنی مثنوی باد مخالف) پسندیدہ طبع عالمے افتادہ است انشاء اللہ العظیم زین بعد عریضہ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نوردد آں خواہد بود"

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبرآباد گئے ہوے ہیں - مرزا انکو اپنے قدیم وطن اکبرآباد کی یاد میں، دلی سے اس طرح لکھتے ہیں "جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد، یعنی آب و ہواے اکبرآباد بہ شما سازگار باد گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیک خود (یعنی بدانست خود) از من دور تر رفتہ آید، اما چوں ہنوز در وطنید ہمانا کہ نزدیک با مینید شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد، ما ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) داد شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد - زینہار اکبرآباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند، و از رہگذر ہاے آں دیار الحفیظ گوی، والامان سرای، گذرند، کہ آں آبادچہ ویران و آں ویرانہ آباد بازیگاہ ہمچو من مجنونی، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کف خاک چشمہ خونی ست روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہر گیا (نام رستنی) نہ رستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے - نسیم صبح دراں گلگدہ (یعنی آگرہ) بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رندان را ہواے صبوحی از سر و پارسایاں را نیت نماز از ضمیر فرو ریختے - ہر چند ہر ذرۂ

خاکِ آں گل زمین را از تن پیامے بود دلنشیں، و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، اما تا زمی وقت شمارا در نظر داشتہ در دو پردہ شورِ پرسش برانگیختہ بود، و چشم براہ داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچگاہ ننوشتند کہ رخش سنگیں (یعنی اسپ سنگین کہ در اکبرآباد معروف است) دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بپاسخ سلام من بہ زبانِ موج چہ گفت؟

نواب عبداللہ خاں صدر الصدر میرٹھ برادر نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رامپور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اس زمانے میں مرزا پریشان بہت ہیں اسلیے انکے جواب میں لکھتے ہیں "خدام بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ از غالب بینوا چشم داشتہ اند مگر آں فرسودہ رواں افسردہ دل را۔ کہ ہنوز نہ مردہ است، زندہ پنداشتہ اند

گمان زیست بود برمنت زبیدردی بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

کاش کشایش ایں کار چوں صنعتِ نقاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوشش دست و باز و صورت بستے تا چشم از خستگیِ دل پوشیدمے، فرمان پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدمے۔ چہ کنم چوں سرایں رشتہ در دستِ دلست تا دل برجائے نباشد زباں سخن سرائے نباشد۔ دیدہ وراں صاحبدل دانند کہ چہ قدر ہا دیدۂ دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے۔ بدال شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند۔ انگیختہ شود۔ ایں دل شکستۂ بہم نہ پیوستہ کہ دریں سینۂ من و ہمانا دشمن دیرینۂ من ست۔ زنہار بکار سخن گستری نیاید و معنی آفرینی را نشاید۔ + +

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اوّل ہی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ہیں اسکے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں "خواہش تک و اصلاح

مہر افزود۔ چنداں کہ دیدہ بماں سواد و ختم نازیبا صورتے بنظر در نیاید۔ ہنجار و روش خود از نیرد ہائے درونی ست آرے نے خامہ در بنان ہر کس خرامے دیگر دارد۔ آموزش را دریں پردہ راہ نیست، واگر گویند ہست، ہر آئینہ می توانم گفت کہ نیست مگر بہ ہمنشینی و ہمزبانی آموزگار، و بسر بردن روزگار در سرہ کردن گفتار، چوں صحبت صورت ندارد، و گفتہ اید کہ ہر چہ بہ نمط گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند می باید حلقہ بر در دل زد و ہمت از مبدأ فیاض دریوزہ کرد۔ بکثرت مشق، و فراوانی ورزش، و پیروی رہروانِ راہ داں کشاکش روے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ و گفتار را سرمایہ خواہد افزود۔

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اُسکی داد چاہی ہے وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے

سبحان اللہ! با آنکہ از فرامش کشتگانم، دانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ نیم خس بر نگیرد۔ ہر گاہ بساز دادنِ آہنگ گلہ روے آرم، و سنجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، واز قہرمان اندیشہ دور باشے (یعنی امتناعی) درمیان نیست۔ ہر آئینہ۔ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست روے سخنے ہست۔ آنچناں بر خویشتن می بالم کہ غم جانگداز فراموشی فراموش، ولب از زمزمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

از خویشتن بذوق جفا با تو ساختیم با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعرفی گفتہ آید چوں کوشش اندیشہ بجاے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند، و نہ مرا جاے ناگزیر آں

ابیات را برکسی عرضہ نمیدارم کہ چوں من صد وچوں عرفی صد ہزار را بسخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہریک بہریک تواند نمود۔ والسّلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفتر طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اسلیے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جاے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی جائیں انکو ایک دوسرے کے محاذی لکھدیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کونسا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اوّل معرفت الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں انکو بادشاہی اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ

مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری	غالب
تاجداری لفظ و معنی چشمت شنای تارک انگشت کہ سمی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را در رفعت اقلیم بہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ اول معرفت کہ با وجود جذب کثرت در مشاہدۂ شاہد وحدت معنی کلام مجز نظام لو کشف الغطا، لما ازدت یقیناً وصف حال او ساختہ اگلستان نیت و بوستان عقیدتش از خس و خاشاک شک و شبہہ پرداختہ مجموعہ عرفان موحدان فردے از دفتر ثنا سائیش عتف و اشتلم ماسوے پسندیدہ طبع و آسائیش بہ توضیح بیانش نشانہاے بے نشان (یعنی ذات بے نشان) ہمہ دلنشیں و خاطر نشان بہ آفتاب جہاں گرد تاکید نظر بر دو بینان نیندا ختن و بہ مصور قضا تہدید با حوال احولان نپرداختن زنار را با سبحہ نپیوندیست	از انجا کہ بعد ہر دو رطوبت دیگر ست، و پس از ہر انجام سر انجامے جداگانہ، در ہر عہد صد اسم دیگر ست (یعنی اسمے دیگر از اسماے الٰہی) دور ہر وقت و وقت کشایش طلسمے دیگر فرۂ ایزدی (نشان الٰہی) کہ چندے را بہ نام آوری شکوہ و غنا از سیاہ درخشیدے و اندے را بہ نشانمندی فقر و فنا فروغ بخشیدے مظہرے کامل و مکمل۔ روشن خواست تا دراں مظہر ظہور ہر دو رنگ و دراں مرأت رویت ہر دو صور یکبارہ رو دہد۔ او رنگ و منبر کے شد و سادہ سجادہ را دوئی از میان رفت۔ درفش کاویانی (از نشان بادشاہی است) از عصا و رواکہ ہر دو شعار درویشان و ہر دو درفش جمع آمدہ) مست پذیرفت کہ پیدائی من بہ پیوند ایں دو جزو باز بستہ است و عصا و رواد درفش را سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقش جمعیت ما رسانشستہ ست بیکدگر خوردن این دو قدح (یعنی فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید

که گسستنش بر کشاکش کشیشان	آورد، و بهم آوردن این دو قوس
(یعنی قسیسان)، نه خندد، و کفر را	نقش دائره پدیدار کرد. از سرجوش
به ایمان نه مریست که صداعش صنمان	فروش مهر و ماه با فشردن و پالودن و
چاره از پیشانی برهمنان نبرد. از صدمه	شستن پیکری ساختند و بهر دفع
توحیدش دوئی در یکی گریخته، و به	گزند چشم بد از پروین و پرن بران
علاقه تجریدش خودی در توئی آویخته	پیکر سپند سوختندش (ابتاج شاهی
گوشے حق شنو، چشمے حق بین دے	افراختند)، و دلش را بنور الٰہی افروختند
حق جو، خاطرے عرفان زا سینہ معرفت	٭٭٭ + زہے در انجمن خلوت نشیں
حینہ، استار کے آسماں ساجبہ سجدہ ریز	و بہ پادشاہی کار آگہی گزیں —
	پادشاہاں در انجمن ازاں کار آگاہ
	ادب آموختہ، و کار آگاہاں در خلوت
	ازاں پادشاہ فیض اندوختہ ٭٭٭

ظہوری

مثنوی

پائے رفعت بر آسماں دارد
سر خدمت بر آستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرز او طرز حق پرستیدن
خلوت دیگران و صحبت او

غالب

مثنوی

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نۂ
دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نۂ
در ہزاراں مرد مردِ رہ یکیست
آدمی بسیار اما شہ یکیست
ور تو می پرسی کہ مردِ راہ کیست

لہ یہ شعر مثنوی معنوی کا مشہور ہے۔ اسی لیے مرزا نے بغیر حوالے کے یہاں لکھ دیا ہے اور فرق کے لفظ نے نہایت لطف پیدا کر دیا ہے۔ ۱۲

وحدت این و آن و کثرت او
جز سراج الدین بہادر شاہ کیست

درویش این و آن نہ می گنجد
در طریقت رہنمائے رہروان

ہیچ جز حق دراں نہ می گنجد
در خلافت پیشوائے خسروان

بت شکن گشت چوں خلیل نخست
آنکہ چوں از راز وحدت دم زند

بادش ارزانی اعتقاد درست
دفتر کون و مکاں برہم زند

کفر در فکر نکتۂ عرفاں
آنکہ چوں در نے نوا را سر دہد

شرک در شکر نعمت ایماں
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد

طینتش باج خواہ طینت ہا
شبلی از منبر دہد آواز عشق

نیتش پادشاہ نیت ہا
شاہ ما بر تخت گوید راز عشق

در عبادت زہے تنومندی
عشق دارد پایہ ہر کس نگاہ

بندگی در خورِ خداوندی
منبرا از شبلی و تخت از پادشاہ

سر وحدت بمغز بردا پوست
آنچہ ابراہیم ادہم یا فقست

ہمہ او کرد خویش را ہمہ اوست
بعد ترک مسند جم یا فقست

شاہ ما و ادہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاج خسروی

شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرز بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اس میں وہ فخریہ فقرے جو اُس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں اسی قسم کے

فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیباچہ میں انشا کیے ہیں۔ سو دونوں دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کرکے اس مقام پر مقابل یکدگر لکھتے ہیں۔

حزیں	غالب
ہمایوں خطہ ایست لبالب از جواہر کلم وجواہر حکم۔ روح پرور ہوایش ہمہ اعتدال و جداول سطورش از مامعین مالا مال۔ خاکش مشکین نفس و شمیمش عنبر آگیں آبش خمار شکن ونسیمش مسیح آئین از ہبوط فیضے کہ ساقی کلکش پیمودہ سیاہ مستان حروف سردر کنار ہم فنودہ اند، واز نشۂ ہوش پروازے کہ دست فکرت در جام وسبوے الفاظش ریختہ، خرومستان معنی نشید شوق سردہ بنام ایزد حسن لیلی ست کہ از طرف خیام الفاظ سر برزدہ در جلوہ گری ست، با شور مجنونے ست کہ از وادی تفسیدہ دل برخاستہ در پردہ دریست یوسفتانے ست از گل پیراہنان در موج نگارستانے ست سمین بدنانش	بنام ایزدِ نخستیں نقابیست از روی شاہد ہر ہفت کردہ معنیٔ بجنبش نسیم برافتادہ، یعنی کشاکش دست ناکشیدہ۔ باز پسیں چراغیست از گرمی چراغاں نیم سوختہ پہلو رخ بہ افروختن دادہ، یعنی داغ منت خس نادیدہ۔ کہن داغہاے جنوں ست سراسر بہ ناخنِ شوقی نفس خراشیدہ۔ گرماگرم خونناب بہ دولست بہ تفِ پنہانی دل ناگہ از ناسور تراویدہ۔ کاغذی[1] پیرہنانند یعنی داد خواہانند چوں پیکر تصویر از خیر

[1] الفاظ کو اسلیے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیرہن کہا ہے اور کاغذی پیرہن داد خواہ کو کہتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں معانی کو اسلیے کہ انکی روشنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے مشعل بکف اور سیہ پوش کہا ہے۔ ۱۲

فوج در فوج، سهی پیکرانند در خیابان
سطور دوشادوش - مغان شیوه
دلبرانند: بادهٔ ناز گرم نوشانوش
نازک بدنانند حجاب پرورد گل
پریانند تنها گرد پخته مغزانند برشته
پوست، بیگانه نغزانند آشنا دوست
صوفیانند در وحدت خانه عشق
مست سماع، سوختگانند سپند
آسامست وداع - درویشانند
تجرد کیش، فردکیشانند از همه
درپیش - شیرصولتانند از جوش خط
پلنگینه پوش، دریادلانند از شورش
عشق درجوش وخروش - آئینه پیکرانند
آئینه تاب، پاکیزه گوهرانند یکسر
خوشاب - گلبرگهای شبنم زده بهار
خراشیده نالهای بلبل شاخسار است

واقعه خاموش (یعنی اپنی بیقدری سے
حیران ہیں) مشعل تکلف گرفتگانند
(یعنی فریادیانند) چون آذر از دود
دل سیه پوش + + نگویم دود چراغست
بالالهٔ وداغ، اما سوختگی را سرگزشت
ست وسوختگی را روئداد - نگویم تجلی
طوراست، یاجنت وحور اما نازش
راقلمروست وآرامش راسواد (لواح)
طلسم شعله و دست بازبستهٔ زردشت
خیال شعله پنهاں، و دود پیدا، دل
لوح طلسم و زبان طلسم کشا هنگامهٔ
ابرو بادست برانگیخته جادوی فکر
ابرگهرپاش و باد الماس فشاں
اندیشه طومار نیرنگ ولب افسون
خوان - دود کبابیست باندازپیچ
وتابی که از شعله در دل افتاده
ست برهوا تنق بسته خیل غزاله
ست بساماں جنبشے که درکمین گاه
رودادهٔ است - ازدام بدرسته
جمالیست دربردهٔ نمایش خویش مشاطه
حقیقی راستایش نگار بهانه درست

سایہ بردمندی خویش نخلبند
ازل را سپاس گزار

مرزا اور ابوالفضل کی طرزِ بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبر نامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے ان واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لیے دونوں کتابوں کی طرزِ بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبر نامہ	مہر نیمروز
ترک بزرگترین فرزندان یافث بود۔ ترکان اورا یافث اوغلان گویند و بہشیاری دلی و کارگزاری و رعیت پروری از ہمہ برادران امتیاز داشت بعد از رحلتِ پدر بر تخت فرمانروائی نشست و داد مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی داد۔ و در جائے کہ ترکان او را اسیلول باسلیکائی میگفتند، و چشمہ ہائے آب سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش و مرغزار ہائے دلکش داشت اقامت فرمودہ۔ از چوب	ترک ابن یافث نشان جہانداری یافت و ترکان ایں والا شکوہ را۔ ازاں رو کہ بہ ترکی شہریار جواں را اوغلان گویند۔ یافث اوغلاں گفتند داد و دانش آئین داشت او دریں ہر دو شیوہ روشہائے گزیں داشت خانی و مرزبانی را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را انداز بر نہاد۔ و نزہنگاہ سیلول باسلیقارا۔ کہ چشمہ ہائے رواں و گل و میوہ فراواں داشت از بہر آرامش گزید۔ ازنے و

وگیاه خانه ها اختراع کرد، وخرگاه پدید آورد واز پوست بهائم وسباع لباس پوشیدنی دوخت. وتمک در زمان او ظاهر شد. ودر آئین آوان بود که پسررا جز شمشیرے میراث ندهند وتمام خواسته دختررا باشد. وگویند که او معاصر کیومرث اول ملوک عجم ست، واو اول سلاطین ترکستان است وعمر او دویست وچهل سال بود النجه خان بهترین فرزندان ترکی بود. چون بپایه زندگی ترکی برشدن گرفت او را بمشوره بزرگان برتخت سلطنت نشانده. او خرد دوربین را پیشوائے خود ساخت در عدالت گستری روزگار گذارند. چون پیر شد عزلت اختیار فرمود دیباچی بعد از عزلت پدر واشارت عالیش فرمان رواشد کیوک خان فرزند رشید اوست پدرش در هنگام پدرود کردن جهان سریر خانی باو عنایت فرمود.

علف وچوب گیاه نشیمن ها افراختند، و پوست دام دودرا پوشش تن ساختند گویند نمک به روزگارے پدید آمد، ورنه ازاں پیش تره وگوشت همچنان بے نمک همی خوردند. ترکان شمشیر زن را بفرمان فرزانه شیرافگن (یعنی یافث اوغلان) برنهاد (دستور) وقرار داد آں بود که ازاں همه برگ وساز که مرده مروری (میراث) بازماند جز شمشیر به پسر دهند وهمه بدختر بازگذارند. که هر آئینه تیغ جوهردار فروفهرست گنجینه سیم وزر، بلکه کلید فتح هفت کشورست اگر بدیں پلارک الماس گوں دسترس ست مرد را دست مایه نازیبا ست بالجمله ایں همه رسم وآئین نهاد و پایان کار پس از دویست وچهل ساله بیداری بخواب عدم سر برزمین نهاد. بزرگان دوده پس از یافث اوغلان به فرزند نجت بلندش ایلنجه خان چشم روشنی گفتند. کلدک

مهر نیمروز

او قدر سلطنت را
دانسته در لوازم
آن اهتمام
بجاے آورد.
النجه خان پسر
اوست در آخر
عمر پدر ولیعهد
شد - داد و دهش
را از اندازه بیرون
برد - و ترکان در
زمان دولت
او مست دولت
شده از راه
خردمندی عدول
نمودند - و چون
مدتے بران نگذشت
اولاد و پسر به یک
شکم آمد - یکے
را مغل نام کرد
و دیگرے را تاتار

نهاد و راستی پیشه گزید بدی پیرامون دلش نگذشته، و با بدان
همزبان نگشته - آزاده رو بود و دل بیدیزدان درگرو داشت
تاج و تیغ و نگین زر زندگانی خویش، به نوباوهٔ باغ کامرانی خویش
دیبا چقی خان جوان بخت نوجوان سپرد، و خود ازین خاکزار دهان
برچید - و به آفرین خانه - کز توآن را صومعه گوئی آرمید - دو صد
و پنج سال پارهٔ نموداری اقبال و پارهٔ بیرستاری ذوالجلال
در جهان گذران ماند، و بهنگام ناگزیر درگذشت - دیبا چقی خان
که هم در نظرگاه پدر اورنگ آرائے بود - اورنگ خسروی را
برنمطے تازه آراست، اما بدین دانشوری و دادگری که جز دانش نه
جست و جز داد نه کرد - روزنامه عمرش چون رقم یک صد و هشتاد و
شش سالگی پذیرفت - در نوشتند و بارنامه کجکلاهی و گردنکشی
بنام پسر فرخ اخترش کیوک خان نوشتند ستوده ستایش
درخور بکار آگاهی آبروی پادشاهی افزود - و یکصد و چهل سال
از مرگ امان یافت - فرزانه تا از شاهی نشان یافت جهان را
بخوشی و خوشنودی و جهانیان را به مهر و آزرم نگاهداشت و
سرانجام کار جهان و جهانیان را بفرزند خویش النجه خان گذاشت
به تروستی دریاکف، و به بیدریغ بخشی ابر کردار بود - دهش را
بواد بیشی داد - و فردوستان (زیردوستان) را به دهش از خواهش
بے نیاز ساخت - سبکساران به باد برفت (یعنی به کبر و غرور) از
جا رفتند - واز دایرهٔ کیش و آئین بدر زدند - آرامشداد

اکبر نامہ

مہر نیم روز

وچوں بحد کابلی رسیدند ملک خود را بہ دو حصہ بخش کردیک نصف را بمغل داد و نصف دیگر را بہ تاتار۔ و چوں پدر بزرگوار ایشاں وديعت حیات سپرد فرزندان بایکدگر موافقت نمودہ ہر کدام در ولایت خویش خود آرائی میکردند

(یعنی انتظام) کنار گرفت و بت پرستی صورت پذیرفت۔ بانوی ایں فرماں روائے بابرگ و نوا دو پسر توام زاد۔ اورنگ نشین (یعنی النجہ خاں) یکے را مغل خاں و دیگر را تاتار خاں نام نہاد۔ ہر دو را بناز پرورد۔ چوں برنائی رسیدند قلمرو خویش را دو نیم کردہ نیمہ بہ تاتار نامزد کرد و خود یکصد و بست و ہفت سال در گیتی درنگ ورزیدہ پے رفتگاں برداشت اللہ اللہ ایں را نیز چوں روز فرو رفتگانِ دگر روز فرو رفت ؎

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
ہم خزاں ہم بہار در گزراست

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور انکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا ختم ہوگیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب ان تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جن کی آجکل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے، اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہمکو اس اندھی اور بہری دیوی نے

مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی سے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل لبِ ما عشق ست کہ بر بستہ زبان ادب ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے اسکو چاہو اس معتقدانہ جوش عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے، بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہمکو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے اس سے لوگوں کو بواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے، ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے گو انکو خود یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انکی سعی محض بے حاصل اور انکی کوشش سراسر بیہودہ ہے۔ اسی طرح کوئی ذرّہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظام کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہ تو روی نیست در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یادگار غالب کو ہم نے دو حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں مرزا کی لائف یعنی انکی زندگی کے حالات اور ان کے اخلاق و عادات کا بیان ہے،

اور دوسرے حصے میں انکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کوئی مہتم بالشان واقعہ انکی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا مگر با اینہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہل وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ انکی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش اور نشو و نما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جسکے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی ناز برداریاں اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوان شباب میں اُنکا جادہ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہولی نشے ہرن نہ ہوے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ صبح کا بھولا شام کو آجائے تو بھولا نہ جانو" انھوں نے اپنے فضل و کمال حسن معاشرت شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے۔ جو کہ انکے ذاتی جوہر تھے۔ وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اسکو اخیر عمر تک نباہ دیا، غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اسکا خیال نہ چھوڑا اور باوجودیکہ زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا

اس کو اس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اسکا منتہاے کمال تھا۔
اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہ ہوے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی بلکہ جن اللے تللوں میں بچپن اور جوانی گذری تھی اسکے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اخیر دم تک حور بعدالکور میں مبتلا رہے۔ اسکے سوا امراض جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ روح رہا۔ باوجود اسکے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک انکی رفیق حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زار نالیاں انھوں نے کی ہیں وہ بظاہر بیصبری اور تنگ حوصلگی پر جو ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ دلالت کرتی ہیں، لیکن درحقیقت یہ انکی شاعری اور انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جسکی زمین اُن کے پانوں کو لگ گئی تھی۔
اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزو اعظم ہے، دوسرے ہر شاعر ایک خاص رنگ کا کلانوت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امرالقیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عنترہ کے بیان میں مشہور تھا۔ اعشےٰ حسن طلب اور وصف شراب میں ضرب المثل تھا، اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا نظامی بزم کا اور سعدی موعظت کا چونکہ مرزا خاصکر رنج و مصیبت کے بیان میں یدطولیٰ رکھتے تھے اس لیے یہ مضمون اکثر انکے قلم سے تراوش کرتا تھا۔
اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اسکے اندازہ کرنے سے عاجز تھا۔ پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا نہیں بٹھا سکے

مگر وسعتِ اخلاق حسنِ معاشرت، اور صلح کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کرلیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور ہر ایک کے ساتھ انکے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں انکے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھکر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور انکی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاس وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا وغیرہ اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دارالخلافت کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی ہیں انکی ذات میں جمع تھیں خصوصاً وفاداری، حق شناسی، اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کی قدیم خاندانوں کا شعار تھا مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چونکہ انکے چچا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے اور انکی وفات کے بعد گورنمنٹ نے انکے پسماندوں کے لیے۔ جن میں سے ایک مرزا بھی تھے کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا، مرزا نے جیسا کہ انکی تحریرات سے ظاہر ہے۔ اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا تمام عمر ملکہ معظمہ اور وبسرائوں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی بعض

افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ سے سمجھتے رہے غدر کے زمانے میں فوج باغی کے ظلم وستم سے جو اثر انکے دل پر ہوا تھا وہ انکی کتاب دستنبو سے جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی۔ ظاہر ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ وکمشنر دہلی کے بیگناہ مارے جانے پر سخت صدمہ انکو پہنچا تھا وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا ظاہر ہے۔ وہ اس خط میں لکھتے ہیں یکے از ستمگرانِ ناخدا ترس۔ کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر راکہ رزیڈنٹ دہلی وغالب مغلوب را مربی بود۔ درشب تاریک بضرب تفنگ کشت، ومراغم مرگ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت، وستر گ اندوہے سراپائے اندیشہ را فرو گرفت۔ خرمن آرامیدگی پاک بسوخت، نقش امید از صفحۂ ضمیر سراسر سترده شد"

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصناف سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جا بجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہل جاہ کی بھٹئی میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا اس کی تکمیل انکے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی، کیونکہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی اور کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔

یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی، اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اُسکو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہل دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی یہ ہے کہ انکا ممدوح مخاطب صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسن کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو۔ وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمال شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبّی سیف الدولہ کی یا عرفی خانخانان کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذالک چند قصیدوں کے سوا۔ جو دوستوں کی ترغیب و تحریض سے اُنھوں نے کسی اُمید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیس کی مدح میں لکھے ہیں باقی انکے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں۔ یا اپنے معزز اور لایق ہمعصروں کی تعریف میں اور یا ان لوگوں کی شان میں جنکو وہ اپنا مربّی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جنکی مدح سرائی کا فرض بطور شکر گزاری و منعم پرستی نہ بامید صلہ و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعہ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکہ معظمہ اور وایسرایان کشور ہند اور دیگر اعیان و ارکان سلطنت انگلشیہ یا فرمانروایان ریاست رامپور و الور وغیرہ۔

با اینہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہل دنیا کی مدح سرائی

پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوان فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں" در ہوائے کربال بلاخوانی زدہ و در ادائے کہ خود را بہ شکرفنی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اسقدر فخر کیا ہے) نیمۂ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے) دنیمۂ دیگر تو نگرستانی ست۔ یعنی بادخوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے) بیداد ہیں! کہ ہر جا بشانہ۔ خمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود بلا در من آویزد تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے، وخواری نگر! کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگ سروری کج نشیند ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیشش بندہ زار راست ستمے۔ شادم از آزادی کہ لبسا سخن بہ ہنجار عشقبازاں گزار دستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردار دنیا طلبان در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر سبک سیر لختے بہ جامۂ وچنگ سر آمد، و پارہ بہ دروغ و دریغ رفت۔

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا لکھا گیا۔ اب ہم چند سطریں انکے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں

ہم نے اس کتاب میں۔ جیساکہ مکرر بیان ہوچکا ہے۔ مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری وانشاپردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی۔ جہاں تک کہ ان کی نظم ونثر اس پر شہادت دے سکتی ہے۔ صاحبانِ ذوق سلیم پر واضح دلائح ہو جائے۔ اگرچہ فی الحقیقۃ طریقہ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے۔ لیکن اگر بالفرض اسکا پورا ہونا تسلیم کرلیا

جائے تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے۔
زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقے کی شاعری اگرچہ ابھی تک اسکا نعم البدل پیدا نہیں ہوا روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے جو باتیں پہلے محاسن کلام میں داخل تھیں اب ان میں سے اکثر داخل عیوب سمجھی جاتی ہیں اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا۔ مگر زمانے کا رخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آیندہ تمام قافلوں کو جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے تو بھی اس زمانے میں انکی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے بلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جسکا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اسکو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یوروپ کی موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ حاصل کرتے

اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں تو ہمارے ہموطن کیونکر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جس طرح زمانہ حال کے انجینیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجینیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہمکو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانہ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو لیکن اس سے مرزا کے کمال شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے۔ آج اہل زبان انکی طرز شاعری کو نام رکھتے ہیں، خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوے ہیں اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہد حکومت میں ایران یا ہندوستان میں علم امتیاز بلند کیا تھا انکی شاعری کو جیسا کہ رضا قلی خاں ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے۔ آج اہل زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی تتبع کا دم بھرتے ہیں حالانکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گذرے ہیں جن کے

کمال اور استادی کا انکار نہیں ہوسکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشاپردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا اسکے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا، وہی چند میدان جن میں انھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ہمیشہ مرزا کے جولان گاہ رہے، لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری انکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رُخ کرتا ہے اُدھر اپنا راستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے اسکو کامیابی کے ساتھ طے کر جاتے۔ وہی بارود جو آتشبازی میں بچوں کا جی لبھاتی ہے جب اسکو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی جس نے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حُبِّ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگادی اعلیٰ درجے کا ملکہ شاعری کسی خاص زمانے یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا، پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی ویسی متاخرین میں نہیں ہوسکتی، یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکۂ شاعری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسی مصوری کی قابلیت یا سریلی آواز۔ جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ہر

ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شانوں میں ظہور کرتا ہے، اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈالدیتا ہے وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اسکا مذاق ہے انیس اسی ملکہ شاعری کے ساتھ جو اسکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور اسی سوسائٹی میں نشو و نما پاتا جس میں فردوسی نے نشو و نما پائی تھی تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی نے پایا تھا اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اسکے دماغ میں ودیعت کی تھی۔ اگر ہندوستان کی اس سوسائٹی کے سایہ میں پلتا جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متاخر شاعر کہتا ہے۔

نیست اندر زمانہ محمودے ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصریست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

مرزا نے جس وقت شعر فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اسوقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا، ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی، دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شایع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم ہوگئی جو لوگ شعر

فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزلیں ان سے بہت زیادہ مقبول خاص وعام تھی مگر۔ اُن وجوہات سے جو متاخرین کو طرز جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جنکا ذکر ہم دوسرے حصّے میں کر چکے ہیں۔ مرزا نے اوّل بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہل زبان اس طرز کو تکسال باہر خیال کرتے تھے، نظیری وعرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے نا پرساں زمانے میں پیدا ہوا اور جسنے فارسی شاعری میں نظیری وعرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اسکے کہ انکا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اُس نے اس طرز شاعری میں کسقدر کامیابی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے سو اسکو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور دو چار، البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دور کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد اُمید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت واستعداد کا اعتراف کرینگے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس روش پر ڈالدیتا وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے تو اسکے کلام کی روانی اور بیساختہ پن دیکھکر اُنکو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا، اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بیساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت

نہیں رہا تھا اسلیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی وغیرہم کا۔ جنکو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم پلہ قرار دیا گیا ہے سو قطع نظر اسکے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعویٰ پر قایم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اسکا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں اوّل یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہل زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشروؤں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتدا سے آجتک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں اکثر پیرو اپنے پیشروؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے، مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بہ قدم چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو جو یقیناً اسکے پیشرو تھے۔ غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو اُن سے پہلے ہوے بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف ان کا ہم پلہ قرار دیا جاے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے ایک امیجینیشن یعنی قوت متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت جیسا ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زباندان بہ نسبت اہل زبان کے ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت۔ اگرچہ بظاہر اہل زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاصکر اس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہل ایران کی برابری کر سکتا ہے علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحاے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زبان جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحاے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہل زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دورے کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا ان سے کم سمجھیں یا انکے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری بات سو اسکی نسبت پہلے حصے میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرت مطالعہ اور غواصی فکر اور مشق سخن اور خاصکر اپنی خداداد لٹریری

قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کرلیا تھا جس سے ایک زبانداں مثل اہل زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ میکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہوسکتا بیشک اُنکا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے اسکا میدان اسی قدر وسیع ہے جسقدر نیچر کی فضا۔ اسکے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہییں اور نہیں ہوسکتے، بلکہ ایشیائی شاعر جو طریقہ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُسکی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاصکر ستاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کرگئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا ہی کمال شاعری سمجھا جاتا ہے اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے جسکو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اسکو شعرائے اہل زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بہتر استعمال کرسکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری وعرفی کے ساتھ طرف قصیدے اور غزل میں ہوسکتا ہے کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بیشک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحب

آتشکدہ نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بدگفتہ است" اور باقی کی نسبت اسکا یہ قول ہے کہ "بسیار بدگفتہ" حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے۔

مثنویش طرز فصاحت نداشت　　کان نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اسکا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے کہ اسکو مثنوی پر بھی تقریباً اُسی قدر قدرت ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری و عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے مگر اُس میں اوّل سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی۔ یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش۔ کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں جس سے لکھنے والے کی قدرت بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرز بیان اور طرز عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کیجاے تو بھی اسکے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسکو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی۔ بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرز خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا خصوصاً فخر و خودستائی، غم و اندوہ اور شکایت و زار نالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں اسکی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہل ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو۔ ہر شخص آزادی

سے اپنی راے ظاہر کرسکتا ہے - لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہوگئی ہے، اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اسکے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری راے کا حاصل یہ ہے کہ انکا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں - جو ممکن ہے کہ اہل زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوے ہوں مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا اہل زبان کا کلام پاک نہیں ہوسکتا اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آسکتا ولله درّ القائل

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست در یدِ بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدر ضرورت بحث کرچکے ہیں مرزا کا موازنہ شعراے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہوسکتا ہے، کیونکہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں انکا کلام کَاَنْ لَمْ یَکُنْ ہے، اور اُردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں - مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر سودا کی روش پر نہیں ہے، مگر خواص اہل ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں - اُنکے چیدہ و برگزیدہ

اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔
مرزا کی مزا اُردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اسکو پسند کیا ہے انھوں نے اُردو خط و کتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے۔ جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اسکی پیروی کی ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا، اور چونکہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے ایسلے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہونگے۔